





مشرق

کہانی میگزین

18 تا 24 اکتوبر 2026



قائدِ جمہوریت
شہیدِ ملت

18 اکتوبر سانحہ کارساز

جس نے خوشیوں امیدوں کے سفر کو سسکیوں اور آہوں میں بدل دیا

روس کا دوہرا دورہ: کابل اور اسلام آباد میں نیر شنکن اور کوکو لوکولتسیف کی آمد

کیا ماسکو پاکستان-افغانستان کشیدگی کا ثالث بن سکتا ہے؟



18 اکتوبر سانحہ کارساز







جس نے خوشیوں امیدوں کے سفر کو سسکیوں اور آہوں میں بدل دیا

18 اکتوبر 2007ء کی محترمہ بے نظیر بھٹو کی کراچی واپسی محض ایک سیاسی رہنما کی وطن واپسی نہیں، بلکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور عوام کی جانب سے اپنی قائد کے ساتھ وابستگی، امید اور سیاسی ولولے کا ایک غیر معمولی عوامی مظاہرہ بن گئی تھی۔



تحریر: محمد ضرار یوسف

18 اکتوبر 2007ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی کراچی واپسی محض ایک رسمی استقبال نہیں تھی، بلکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے اسے ایک بڑے عوامی سیاسی اجتماع، عوامی طاقت کے اظہار اور جشنِ استقبال میں تبدیل کر دیا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں، خصوصاً سندھ کے اضلاع سے کارکن چھوٹے بڑے قافلوں کی صورت میں کراچی پہنچے۔ لاڑکانہ اور قمبر شہداد کوٹ سے ہی 100 سے زائد بسوں، ویگنوں اور دیگر گاڑیوں کے قافلے روانہ ہوئے تھے۔ کارکنوں نے بڑے بڑے سرخ، سبز اور سیاہ پیپلز پارٹی کے پرچم اٹھا رکھے تھے، جبکہ بعض مقامات پر عمارتوں پر بھی بڑے پارٹی پرچم آویزاں کیے گئے تھے۔ محترمہ کا طیارہ رن وے پر اترتے ہی کارکنوں نے نعروں، تالیوں، ڈھول کی تھاپ، پارٹی ترانوں اور علاقائی دھنوں پر رقص کے ذریعے اپنی خوشی اور والہانہ عقیدت کا اظہار کیا۔

استقبال سے ایک رات پہلے ہی کراچی کے مختلف علاقوں میں کارکن پارٹی ترانوں اور لوک دھنوں پر رقص کر رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا ملک کراچی کی شاہراہِ فیصل پر امڈ آیا ہو اور اپنی قائد کی آمد پر مسرت و شادمانی کے نغمے گا رہا ہو۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے تن پر پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑے تھے اور جن کے چہروں پر بھوک اور افلاس کی سسکتی ہوئی داستان نمایاں تھی، لیکن اس روز ان کی آنکھوں میں امید کی ایک نئی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

محترمہ کی واپسی کے خیر مقدمی پوسٹرز، بینرز اور بل بورڈز بڑی تعداد میں تیار کر کے شہر کے مختلف مقامات پر نصب کیے گئے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو خصوصی بلٹ پروف گاڑی پر سوار ہوئیں اور ایک عظیم الشان جلوس کی صورت میں شہر کی طرف روانہ ہوئیں۔ ہجوم اس قدر وسیع تھا کہ تقریباً دو کلومیٹر کا ابتدائی فاصلہ طے کرنے میں ہی تقریباً چار گھنٹے لگ گئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے نوجوانوں اور طلبہ تنظیموں کے رضا کاروں پر مشتمل "جان نثارانِ بے نظیر" (JNB) کا خصوصی حفاظتی انتظام بھی تشکیل دیا گیا تھا۔ اقوام متحدہ کی تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق تقریباً 5,000 رضا کار اس انتظام میں شامل تھے؛ ان میں تقریباً 2,000 نے محترمہ کی گاڑی کے گرد انسانی حفاظتی زنجیر بنا رکھی تھی، جبکہ باقی رضا کار جلوس کے مختلف حصوں میں تعینات تھے۔

جلوس کے دوران عوام اور کارکنوں نے محترمہ پر پھول نچھاور کیے، جنہیں وہ بعض اوقات واپس ہجوم کی طرف اچھال دیتی تھیں۔ کارکن ہاتھوں کی انگلیوں سے وکٹری (V) کا نشان بناتے، پارٹی نعرے لگاتے اور محترمہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سڑکوں، عمارتوں اور دیگر بلند مقامات پر موجود رہتے تھے۔ اس استقبال کی وسعت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کراچی میں معمول کی شہری زندگی تقریباً مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ متعدد مارکیٹیں بند رہیں، پبلک ٹرانسپورٹ بڑی حد تک سڑکوں سے غائب رہی اور بعض پروازیں بھی منسوخ ہوئیں۔

یوں 18 اکتوبر 2007ء کی محترمہ بے نظیر بھٹو کی کراچی واپسی محض ایک سیاسی رہنما کی وطن واپسی نہیں، بلکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور عوام کی جانب سے اپنی قائد کے ساتھ وابستگی، امید اور سیاسی ولولے کا ایک غیر معمولی عوامی مظاہرہ بن گئی تھی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کا استقبالی قافلہ کراچی ایئرپورٹ سے مزارِ قائد کی طرف شاہراہِ فیصل پر عوام کے عظیم الشان ہجوم کے باعث انتہائی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کراچی جناح انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے کارساز فلائی اوور عبور کرنے کے بعد تقریباً 100 میٹر آگے تک کا فاصلہ تقریباً 8 سے 9 کلومیٹر بنتا ہے، جو تقریباً دس گھنٹے کے سفر کے بعد قافلے نے طے کیا اور یہاں پہنچا۔ محترمہ نے ایک شخص کو دیکھا جو پاکستان پیپلز پارٹی کے جھنڈے کے رنگوں میں ملبوس تقریباً ایک یا دو سالہ بچے کو اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ شخص مسلسل اشاروں سے محترمہ کو بچے کو لینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ محترمہ نے ہجوم کو راستہ دینے کا اشارہ کیا، لیکن جب راستہ بنا تو وہ شخص خود آگے نہ آیا بلکہ بچے کو ہجوم میں کسی دوسرے شخص کے حوالے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ محترمہ کو خدشہ ہوا کہ بچہ گر کر لوگوں کے پاؤں تلے کچلا جا سکتا ہے یا ہجوم میں گم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے اپنے پاس لانے کا اشارہ کیا۔ پھر اس شخص نے سکیورٹی گارڈ کی طرف اشارہ کیا، جس پر محترمہ نے کہا کہ اسے ٹرک پر آنے دیا جائے۔ تاہم، اسی دوران محترمہ خود ٹرک کے اندرونی حصے میں چلی گئیں، کیونکہ مسلسل تقریباً دس گھنٹے کھڑے رہنے کے باعث ان کے پاؤں سوج گئے تھے۔

آغا سراج درانی اس وقت محترمہ کے ٹرک تک لوگوں کی رسائی کی نگرانی کر رہے تھے۔ جب اس شخص نے بچے کو ٹرک تک پہنچانے کی کوشش کی تو آغا سراج درانی نے اسے وہاں سے جانے کو کہا۔ اس کے بعد وہ شخص ٹرک کے بائیں جانب موجود پولیس گاڑی کے پاس گیا، لیکن وہاں بھی بچے کو لینے سے انکار کر دیا گیا۔ پھر وہ شخص سامنے موجود دوسری پولیس گاڑی کے پاس گیا۔ اس گاڑی میں پاکستان پیپلز پارٹی کی کونسلر رخسانہ فیصل بلوچ اور ایک کیمرہ مین بھی موجود تھے۔

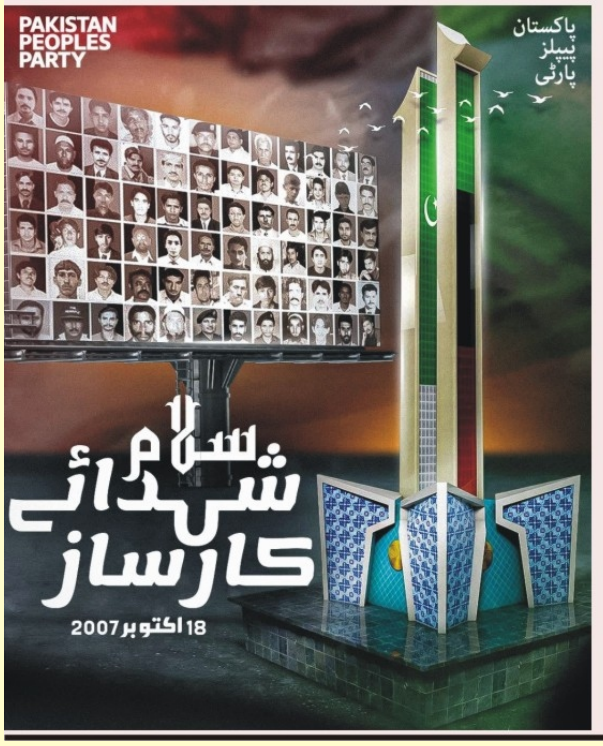
جب وہ شخص بچے کو دوسری پولیس گاڑی میں دینے کی کوشش کر رہا تھا تو پہلی پولیس گاڑی سے اسے خبردار کیا گیا:

thetaket'donbaby,thetaket'Don''
theonupbabythelett'donbaby,
''truck.

یعنی: ''بچے کو مت لو، بچے کو مت لو، اسے ٹرک پر مت چڑھنے دو۔''

اور پھر اسی کشمکش کے دوران پہلا دھماکہ ہوا، جس کے نتیجے میں اس پولیس وین میں موجود تمام افراد ہلاک ہو گئے۔ تقریباً 50 سیکنڈ بعد 15 کلوگرام وزنی کار بم کا دوسرا دھماکہ ہوا۔

یہ دھماکے رات 10:12 سے 12:12 بجے کے درمیان ہوئے، یعنی کیلنڈر کے اعتبار سے یہ واقعہ 19 اکتوبر کو پیش آیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ریکارڈ اور متعدد رپورٹس کے مطابق، ان دھماکوں میں موقع پر ہی 177 سے 180 کے درمیان افراد شہید ہوئے۔ اور پانچ سو سے زاید زخمی ہوے. جن میں سے متعدد ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیے پولیس اہلکاروں سے متعلق دستیاب تفصیلی رپورٹ کے مطابق، ان دھماکوں میں 20 پولیس اہلکار بھی شہید ہوئے، جبکہ پولیس کی تین موبائلیں بھی تباہ ہو گئی تھیں۔



پاکستان میں عام انتخابات 18 فروری 2008ء کو منعقد ہوئے۔ ان کے بعد پیپلز پارٹی کی قیادت میں مخلوط حکومت قائم ہوئی۔ اس سے قبل 26 اگست 2006ء کو نواب اکبر بگٹی ہلاک ہوئے، جولائی 2007ء میں لال مسجد آپریشن ہوا، اور 2007ء کے دوران وکلا تحریک کے پس منظر میں عدلیہ کے خلاف اقدامات کیے گئے۔ اس کے بعد 18 اکتوبر 2007ء کو سانحہ کارساز پیش آیا، 27 دسمبر 2007ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کو شہید کر دیا گیا، اور 9 اپریل 2008ء کو کراچی میں پُرتشدد واقعات رونما ہوئے

محترمہ بے نظیر بھٹو 18 اکتوبر 2007ء کو سانحہ کارساز کے خودکش حملے میں تو محفوظ رہیں، مگر 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ، راولپنڈی میں شہید کر دی گئیں۔ طالبان کے ایک کمانڈر اور مصنف نے اپنی کتاب میں محترمہ بے نظیر بھٹو پر خودکش حملے کی منصوبہ بندی اور اس کا حکم دیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے اس حملے کی ذمہ داری بیت اللہ محسود اور طالبان پر عائد کی۔

پاکستان میں عام انتخابات 18 فروری 2008ء کو منعقد ہوئے۔ ان کے بعد پیپلز پارٹی کی قیادت میں مخلوط حکومت قائم ہوئی۔ اس سے قبل 26 اگست 2006ء کو نواب اکبر بگٹی ہلاک ہوئے، جولائی 2007ء میں لال مسجد آپریشن ہوا، اور 2007ء کے دوران وکلا تحریک کے پس منظر میں عدلیہ کے خلاف اقدامات کیے گئے۔ اس کے بعد 18 اکتوبر 2007ء کو سانحہ کارساز پیش آیا، 27 دسمبر 2007ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کو شہید کر دیا گیا، اور 9 اپریل 2008ء کو کراچی میں پُرتشدد واقعات رونما ہوئے۔ ان واقعات کے تناظر میں یہ رائے عام تھی کہ صدر جنرل پرویز مشرف کی سرپرستی اور حمایت نے ان حالات کو جنم دینے میں کردار ادا کیا۔ ان واقعات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی مخالفت، جنرل پرویز مشرف کی بڑھتی ہوئی تنہائی اور حکمران اتحاد کی جانب سے ان کے مواخذے کا فیصلہ ان کے لیے اقتدار پر برقرار رہنا مشکل بنانے والے اہم عوامل ثابت ہوئے۔ بالآخر انہیں 18 اگست 2008ء کو صدارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔

اسی دوران میجر جنرل فیصل امیر علوی نے 21 جولائی 2008ء کو چیف آف آرمی اسٹاف کو خط لکھ کر اپنے خلاف کی گئی کارروائی کی وجوہات کی تحقیقات اور متعلقہ جرنیلوں کے خلاف تادیبی کارروائی کا مطالبہ کیا تھا۔ تاہم، ان کے اس مطالبے پر کوئی مؤثر کارروائی سامنے نہ آئی۔ ان کے خط میں اعلیٰ فوجی افسران اور بیت اللہ محسود کے درمیان مذاکرات اور بھاری رقم دینے کا معاملہ بھی اٹھایا گیا تھا۔ بیت اللہ محسود سے مذاکرات اور مالی معاونت کے الزامات اپنی جگہ ایک اہم تاریخی پہلو رکھتے ہیں۔

میجر جنرل فیصل امیر علوی کو جب اپنے چیف آف آرمی اسٹاف کو لکھے گئے خط پر کوئی پیش رفت ہوتی نظر نہ آئی تو انہیں اپنی جان کے بارے میں تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ، 15 نومبر 2008ء کو انہوں نے اپنے خط کی ایک نقل ایک برطانوی صحافی کے حوالے کرتے ہوئے وصیت کی کہ اگر انہیں قتل کر دیا جائے تو یہ خط شائع کر دیا جائے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس خط کے مندرجات اور فوجی افسران کے بیت اللہ محسود سے مذاکرات اور مبینہ مالی معاونت کے راز افشا ہونے کے خدشے کے پیشِ نظر، میجر جنرل فیصل امیر علوی کو میجر ریٹائرڈ ہارون عاشق کے ذریعے 19 نومبر 2008ء کو قتل کروا دیا گیا۔

دسمبر 2007ء میں برطانوی اخبار Scotland on Sunday نے نامعلوم MI5 ذرائع کے حوالے سے رپورٹ کیا کہ پاکستانی خفیہ ادارے آئی ایس آئی کے بعض دھڑے محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ بعد ازاں، 17 جنوری 2008ء کو سی آئی اے کے ڈائریکٹر مائیکل ہیڈن نے کہا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے ذمہ دار بیت اللہ محسود کا نیٹ ورک اور القاعدہ سے وابستہ افراد تھے۔ دوسری جانب، بعض حلقوں نے پاکستانی خفیہ اداروں کے ممکنہ کردار پر بھی شبہات ظاہر کیے۔

اقوامِ متحدہ کے تحقیقاتی کمیشن نے 2010ء میں اپنی رپورٹ میں قرار دیا کہ مناسب حفاظتی اقدامات کے ذریعے محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کو روکا جا سکتا تھا۔ کمیشن نے ان کی حفاظت میں سنگین ناکامیوں، قتل کی تفتیش میں رکاوٹوں اور پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے بعض عناصر کے ممکنہ کردار سے متعلق اہم سوالات اٹھائے۔ جنرل پرویز مشرف نے بھی محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل میں بعض فوجی افسران کے ملوث ہونے کا شبہ ظاہر کیا تھا۔ ان بیانات، رپورٹس اور واقعات کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے پسِ پردہ ممکنہ سازش، دہشت گرد نیٹ ورکس کے باہمی روابط اور بعض ریاستی عناصر کے ممکنہ کردار سے متعلق سازش کی دھندلی تصویر بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے اور متعدد اہم سوالات سامنے آتے ہیں۔

میجر جنرل فیصل امیر علوی کے قتل کے معاملے میں بھی دستیاب رپورٹس کے مطابق، تحقیقات میں یہ بات سامنے آئی کہ ان کے قتل کا ملزم میجر ریٹائرڈ ہارون مشتاق، الیاس کاشمیری کے گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس تناظر میں الیاس کاشمیری اور بیت اللہ محسود کے درمیان مبینہ تعاون اور ان کے نیٹ ورکس کے دہشت گردی کی کارروائیوں میں باہمی روابط کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔



محترمہ بے نظیر بھٹو 18 اکتوبر 2007ء کو سانحہ کارساز کے خودکش حملے میں تو محفوظ رہیں، مگر 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ، راولپنڈی میں شہید کر دی گئیں۔ طالبان کے ایک کمانڈر اور مصنف نے اپنی کتاب میں محترمہ بے نظیر بھٹو پر خودکش حملے کی منصوبہ بندی اور اس کا حکم دیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے اس حملے کی ذمہ داری بیت اللہ محسود اور طالبان پر عائد کی۔



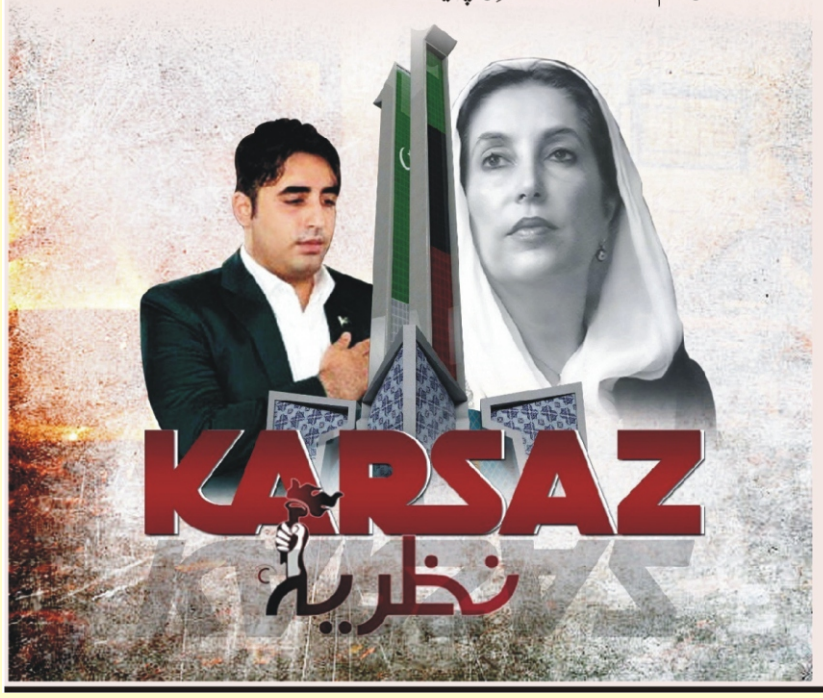


اقوامِ متحدہ کے تحقیقاتی کمیشن نے 2010ء میں اپنی رپورٹ میں قرار دیا کہ مناسب حفاظتی اقدامات کے ذریعے محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کو روکا جا سکتا تھا۔ کمیشن نے ان کی حفاظت میں سنگین ناکامیوں، قتل کی تفتیش میں رکاوٹوں اور پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے بعض عناصر کے ممکنہ کردار سے متعلق اہم سوالات اٹھائے۔ جنرل پرویز مشرف نے بھی محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل میں بعض فوجی افسران کے ملوث ہونے کا شبہ ظاہر کیا تھا۔ ان بیانات، رپورٹس اور واقعات کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے پسِ پردہ ممکنہ سازش، دہشت گرد نیٹ ورکس کے باہمی روابط اور بعض ریاستی عناصر کے ممکنہ کردار سے متعلق سازش کی دھندلی تصویر بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے اور متعدد اہم سوالات سامنے آتے ہیں۔





بعد ازاں، میجر ریٹائرڈ ہارون عاشق کی دہشت گردی قتل اور اغوا کے مقدمات میں بریت نے بھی اس معاملے پر مزید سوالات کو جنم دیا۔ ان تمام واقعات، بیانات اور تحقیقات کو باہم ملا کر دیکھا جائے تو محترمہ بے نظیر بھٹو کے قاتلوں کے چہرے تقریباً بے نقاب ہو جاتے ہیں اور کئی پہلوؤں کی مزید چھان بین کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ فیصل امیر علوی کے قتل کی تفتیش، ملزم کی شناخت، اس کے مبینہ تنظیمی روابط، عدالتی فیصلے اور متعلقہ فوجی افسران کے کردار سے متعلق تمام دستیاب ریکارڈ کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو تمام قیاس آرائیاں دم توڑ کر ایک حقیقی تصویر عیاں ہو جاتی ہے جس کو جھوٹ نفرت اور بغض سے لبریز کر کے رخ موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔O



پاک افغان سرحد کی بندش سے دونوں ملکوں کی معیشت کو کتنا نقصان ہوا؟

دونوں ممالک کے درمیان تمام تجارتی راستے اتنے طویل عرصے تک بند رہے ہیں۔ اس بندش نے لاکھوں کسانوں، صنعت کاروں، تاجروں، ٹرانسپورٹرز اور متعلقہ شعبوں سے وابستہ افراد کی زندگیوں اور کاروبار کو متاثر کیا ہے



معظم خان

پاکستان اور افغانستان کے درمیان تجارتی راستوں کی بندش ایک سال سے زائد عرصے سے جاری ہے اور اس نے دونوں ممالک کی معیشتوں کو گہرا نقصان پہنچایا ہے۔ اکتوبر سنہ دو ہزار پچیس میں دونوں ممالک کے درمیان مسلح جھڑپوں اور حملوں کے بعد پاکستان نے افغانستان کے ساتھ تمام اہم تجارتی راستے بند کر دیے تھے۔ طورخم، سپین بولدک، غلام خان، خرلاچی اور انگوراڈہ وہ پانچ کلیدی راستے تھے جن کے ذریعے نہ صرف دونوں ممالک کے درمیان دوطرفہ تجارت ہوتی تھی بلکہ وسطی اور جنوبی ایشیا کے مابین اربوں ڈالر کی تجارت بھی انہی راستوں سے گزرتی تھی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان تمام تجارتی راستے اتنے طویل عرصے تک بند رہے ہیں۔ اس بندش نے لاکھوں کسانوں، صنعت کاروں، تاجروں، ٹرانسپورٹرز اور متعلقہ شعبوں سے وابستہ افراد کی زندگیوں اور کاروبار کو متاثر کیا ہے۔ طالبان حکومت نے اس بندش کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرایا ہے اور الزام لگایا ہے کہ تجارت کو سیاسی دباؤ کے آلے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ تجارت کو سیاست سے الگ رکھا جائے۔ بندش کے ایک ماہ بعد ہی نائب وزیرِ اعظم برائے اقتصادی امور ملا عبدالغنی برادر نے افغان تاجروں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ متبادل راستے اور نئی منڈیاں تلاش کریں۔

افغانستان پر اس بندش کے اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں۔ افغانستان اور پاکستان کے مشترکہ چیمبر آف کامرس کے سربراہ خان جان الکوزئی کے مطابق پاکستان کے ساتھ تجارتی راستوں کی بندش نے کاروبار پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں، خصوصاً تازہ پھلوں اور سبزیوں کی برآمدات بہت بری طرح متاثر ہوئی ہیں۔ پاکستانی منڈی افغان تازہ پھلوں کے لیے ایک اہم منڈی تھی۔ تاجروں کا کہنا ہے کہ پاکستان کے راستے اور پھر وہاں سے انڈیا بھیجی جانے والی تازہ اور خشک میوہ جات کی مقدار اب عالمی منڈیوں تک نہیں پہنچ پا رہی۔ اس کے نتیجے میں افغانستان کی مقامی منڈیوں میں ان پھلوں کی قیمتیں گر گئی ہیں۔ قندھار میں تازہ پھلوں کے تاجر حاجی سعداللہ نے بتایا کہ تازہ پھلوں کی قیمتوں میں اسّی فیصد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ کراچی بندرگاہ کے ذریعے ہونے والی تجارت بھی متاثر ہوئی۔ افغان چیمبر آف کامرس کے عہدیداروں کے مطابق پاکستان کے بجائے دوسرے راستوں سے اشیا درآمد کرنا مہنگا پڑ رہا ہے، حالانکہ مجموعی طور پر تجارت کو بڑی رکاوٹ کا سامنا نہیں۔ افغانستان اب ایران، روس، ازبکستان، ترکمانستان، تاجکستان، چین، بیلاروس اور ترکی سے زیادہ اشیا درآمد کر رہا ہے، لیکن یہ راستے پاکستان کے مقابلے میں طویل ہیں۔ خان جان الکوزئی کے مطابق چین اور مشرقِ وسطیٰ کے راستوں سے آنے والی اشیا نسبتاً مہنگی پڑ رہی ہیں۔ پہلے پاکستان کے راستے ایک کنٹینر افغانستان پہنچانے پر زیادہ سے زیادہ دو ہزار پانچ سو ڈالر خرچ ہوتے تھے، اب متبادل راستوں سے یہ لاگت دس ہزار ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔





بندش کے چار ماہ بعد امریکہ اور انڈیا کی ایران کے خلاف جنگ نے صورتحال کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ تیل کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ایران کے ساتھ افغانستان کی تجارت بھی مشکل ہو گئی۔ افغانستان کے لیے تجارت کا مختصر ترین اور سستا ترین راستہ پاکستان سے گزرتا تھا، اس کی بندش کے باعث بعض اشیا کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ کابل اور قندھار کے دکانداروں کا کہنا ہے کہ بعض اشیا کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ان کے منافع میں بھی کمی ہوئی ہے۔ قندھار میں کھانے پینے کی اشیا فروخت کرنے والے حضرت ولی قیس نے بتایا کہ پہلے انھیں اسی افغانی منافع ہوتا تھا جو اب کم ہو کر بیس افغانی رہ گیا ہے۔ تاہم اس بندش نے کچھ مثبت رجحانات بھی پیدا کیے۔ افغان صنعت کاروں کی انجمن کے سربراہ عبدالجبار صافی کے مطابق پاکستان کے دباؤ نے افغانستان میں خود انحصاری کی ضرورت اور صلاحیت کو بڑھایا ہے۔ گذشتہ ایک سال کے دوران کئی کارخانے قائم ہوئے اور پیداواری صلاحیت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔

پاکستان کی معیشت بھی اس بندش سے محفوظ نہیں رہی۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے تاجروں اور کاروباری افراد کا کہنا ہے کہ تجارتی راستوں کی بندش سے بڑی تعداد میں لوگ بے روزگار ہوئے ہیں اور کئی کارخانوں میں پیداوار بند ہو گئی یا شدید حد تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ پہلے پاکستان سے ہر سال کروڑوں ڈالر مالیت کا سامان افغانستان برآمد کیا جاتا تھا جس میں مصالحے، ادویات، چاول، ٹیکسٹائل مصنوعات اور تازہ پھل و سبزیاں شامل تھیں۔ پاکستان افغانستان کے راستے وسطی ایشیائی ممالک کے ساتھ بھی تجارت کرتا تھا اور ہزاروں ٹن سامان ان راستوں سے منتقل ہوتا تھا۔ خیبر پختونخوا میں پاکستان افغانستان مشترکہ ایوانِ تجارت کے سربراہ زاہداللہ شنواری کے مطابق صوبے کی نوے فیصد تجارت اور کاروبار کا تعلق افغانستان سے تھا، اب راستے بند ہونے کے باعث کئی کارخانے بند ہو چکے ہیں یا پیداوار کم ہو کر صرف پندرہ فیصد رہ گئی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بندش سے پہلے روزانہ آٹھ سو سے بارہ سو ٹرک طورخم، پانچ سو سے آٹھ سو ٹرک چمن سپین بولدک اور تین سو سے پانچ سو ٹرک دیگر راستوں سے سامان کی ترسیل کرتے تھے۔ پاکستانی ٹرانسپورٹ کمپنیوں کو بھاری مالی نقصان کا سامنا ہے اور ہزاروں ٹرک بے کار کھڑے ہیں۔ طورخم کے راستے تجارت سے وابستہ ہزاروں افراد بے روزگار ہو چکے ہیں۔

اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے دکانداروں کا کہنا ہے کہ وہ اشیا جنہیں پہلے افغانستان سے درآمد کیا جاتا تھا جیسے تازہ اور خشک میوہ جات اور سبزیاں، ان کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ پشاور کے ایک دکاندار عمیر کے مطابق اضافے کے باعث بہت سے لوگ بے روزگار بھی ہو گئے ہیں۔ بندش سے پہلے بھی وقتاً فوقتاً راستے بند کرنے، محصولات بڑھانے اور دیگر رکاوٹوں کے باعث تجارت متاثر ہو رہی تھی، لیکن مکمل بندش نے لاکھوں افراد کو متاثر کیا ہے۔ اسی لیے گذشتہ ایک سال کے دوران تاجروں اور صنعت کاروں نے بارہا حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ تجارتی راستے دوبارہ کھولے جائیں۔ زاہداللہ شنواری کے مطابق افغانستان کے ساتھ تجارتی راستوں کی بندش اور وسطی ایشیائی ممالک کے ساتھ تجارت رک جانے سے ملکی معیشت کو بھاری نقصان پہنچا ہے۔







ایک سال گزرنے کے باوجود دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی برقرار ہے اور تجارتی راستے بدستور بند ہیں۔ انہیں دوبارہ کھولنے کے کوئی واضح آثار نظر نہیں آ رہے۔ دونوں جانب کے تاجر اور عام لوگ سیاست کو تجارت سے الگ رکھنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تجارتی راستوں کی بندش سے سب سے زیادہ نقصان ڈیورنڈ لائن کے دونوں جانب رہنے والے لوگوں کو اٹھانا پڑ رہا ہے۔ یہ بندش نہ صرف دونوں معیشتوں بلکہ خطے کی مجموعی تجارت کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے اور اس کے طویل مدتی اثرات اب بھی سامنے آ رہے ہیں۔

پاکستان کے صوبوں خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے متعدد دکانداروں کا کہنا ہے کہ تجارتی راستوں کی بندش نے ان کے کاروبار کو متاثر کیا ہے اور اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ان میں خاص طور پر وہ اشیا شامل ہیں جو پہلے افغانستان سے درآمد کی جاتی تھیں، مثلاً تازہ اور خشک میوہ جات اور سبزیاں۔ پشاور کے ایک دکاندار عمیر کے مطابق بتایا کہ قیمتوں میں اضافے کے باعث بہت سے لوگ بے روزگار بھی ہو گئے ہیں۔ تجارتی راستوں کی مکمل بندش سے پہلے بھی پاکستان کی جانب سے وقتاً فوقتاً راستے بند کرنے، تجارتی محصولات بڑھانے، ڈرائیوروں کے لیے ویزے لازمی قرار دینے اور کراچی سمیت دیگر بندرگاہوں پر افغان تاجروں کے سامان کو روکنے جیسے اقدامات کے باعث دونوں ملکوں کے درمیان تجارت متاثر ہو رہی تھی۔ تاہم، اب تجارتی راستوں کی مکمل بندش کے نتیجے میں پاکستان کے صوبوں خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں افغانستان کے ساتھ تجارت پر انحصار کرنے والے لاکھوں افراد بے روزگار ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے گذشتہ ایک سال کے دوران پاکستان میں تاجروں اور صنعت کاروں سمیت مختلف حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد بارہا حکومت سے مطالبہ کر چکے ہیں کہ

بندش کے چار ماہ بعد امریکہ اور انڈیا کی ایران کے خلاف جنگ نے صورتحال کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ تیل کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ایران کے ساتھ افغانستان کی تجارت بھی مشکل ہو گئی۔ افغانستان کے لیے تجارت کا مختصر ترین اور سستا ترین راستہ پاکستان سے گزرتا تھا

افغانستان کے ساتھ تجارتی راستے دوبارہ کھولے جائیں۔ تجارتی راستوں کی بندش کے منفی اثرات کے پیشِ نظر نہ صرف پاکستانی تاجر اور خیبر پختونخوا و بلوچستان کے رہائشی عمومی طور پر تجارت بحال کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں بلکہ افغانستان میں بھی لوگ اور تاجر سیاست کو تجارت سے الگ رکھنے کے خواہاں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تجارتی راستوں کی بندش سے سب سے زیادہ نقصان ڈیورنڈ لائن کے دونوں جانب رہنے والے لوگوں کو اٹھانا پڑے گا۔





افغانستان اب ایران، روس، ازبکستان، ترکمانستان، تاجکستان، چین، بیلاروس اور ترکی سے زیادہ اشیا درآمد کر رہا ہے، لیکن یہ راستے پاکستان کے مقابلے میں طویل ہیں۔ خان جان الکوزئی کے مطابق چین اور مشرقِ وسطیٰ کے راستوں سے آنے والی اشیا نسبتاً مہنگی پڑ رہی ہیں۔ پہلے پاکستان کے راستے ایک کنٹینر افغانستان پہنچانے پر زیادہ سے زیادہ دو ہزار پانچ سو ڈالر خرچ ہوتے تھے، اب متبادل راستوں سے یہ لاگت دس ہزار ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔

اربوں ڈالر کا فضائی دفاعی نظام حوثی میزائلوں اور ڈرونز نے سعودی حصار کیسے توڑا؟

10 اکتوبر کو ریاض کے شاہ خالد انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر ہونے والے ایک حملے میں کم از کم 13 افراد ہلاک اور 300 سے زائد زخمی ہوئے تھے۔ اگلے روز اسی ایئرپورٹ پر ایک اور میزائل یا پروجیکٹائل حملہ ہوا جس کے نتیجے میں ایک شخص ہلاک اور 11 زخمی ہوئے۔



.....شیر دل خان.....

ریاض کی شاہ خالد انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے ٹرمینل تین اور چار کے اندر مسافروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں جب اچانک ایک روشن نارنجی چمک نے پورے ہال کو روشن کر دیا۔ چھت کے کچھ حصے گر پڑے، شیشے کی دیواروں کے ٹکڑے ہر طرف بکھر گئے اور دھول و دھوئیں کی ایک گہری تہہ نے پورے ماحول کو ڈھانپ لیا۔ لوگ دوڑتے، چیختے اور گرے ہوئے ملبے کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ یہ منظر 10 اکتوبر کی صبح کا تھا جب یمن کے حوثی گروہ نے سعودی عرب کے دارالحکومت کے اہم ترین ہوائی اڈے پر ایک بیلسٹک میزائل داغا۔ کم از کم تیرہ افراد جاں بحق ہوئے جن میں چار سعودی شہری، دو بنگلہ دیشی اور امریکہ، اردن، فلسطین، شام، سوڈان اور مصر کے ایک ایک شہری شامل تھے، جبکہ تین سو سے زائد زخمی ہوئے۔ اگلے دن اسی ٹرمینل پر ایک اور پروجیکٹائل گرا جس سے ایک شخص ہلاک اور گیارہ زخمی ہوئے۔ پروازیں معطل کر دی گئیں، سکول آن لائن کر دیے گئے اور پورا شہر ایک بار پھر اس سوال کے سامنے کھڑا ہو گیا کہ اربوں ڈالر کی جدید ترین امریکی دفاعی ٹیکنالوجی کے باوجود سعودی فضائی حدود میں دراندازی کیسے ممکن ہوئی۔

یہ حملے کوئی اچانک پیش رفت نہیں تھے بلکہ گزشتہ ایک دہائی سے جاری اس طویل اور غیر متناسب تنازع کا تازہ ترین باب تھے جس میں ایک جانب دنیا کے سب سے امیر ترین ممالک میں سے ایک کا ملٹی لیئرڈ فضائی دفاعی نیٹ ورک کھڑا ہے اور دوسری جانب یمن کے پہاڑی علاقوں میں چھپے ہوئے ایک مسلح گروہ کی نسبتاً سستی مگر مسلسل بدلتی ہوئی صلاحیتیں۔ سعودی عرب نے اپنے فضائی اور میزائل دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے گزشتہ برسوں میں غیر معمولی سرمایہ کاری کی ہے۔ 2017 میں امریکہ نے تھاڈ لانچرز اور متعلقہ میزائلز کی فروخت کے لیے تقریباً پندرہ ارب ڈالر کے معاہدے کی منظوری دی تھی۔ ۲۲۰۲ میں پیٹریاٹ میزائلز کے لیے تین ارب ڈالر کا معاہدہ ہوا اور 2026 میں اسی نظام میں مزید بہتری اور اضافی انٹرسیپٹرز کے لیے تقریباً نو ارب ڈالر کا ایک اور بڑا معاہدہ طے پایا۔ ان معاہدوں کے علاوہ سعودی دفاعی بجٹ میں سالانہ دسیوں ارب ڈالر مختص کیے جاتے رہے ہیں۔ پھر بھی 10 اور 11 اکتوبر کے حملوں نے یہ حقیقت ایک بار پھر سامنے لائی کہ جدید ترین دفاعی نظام بھی سو فیصد حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتے۔





2017 میں امریکہ نے تھاڈ لانچرز اور متعلقہ میزائلز کی فروخت کے لیے تقریباً پندرہ ارب ڈالر کے معاہدے کی منظوری دی تھی۔ 2022 میں پیٹریاٹ میزائلز کے لیے تین ارب ڈالر کا معاہدہ ہوا اور 2026 میں اسی نظام میں مزید بہتری اور اضافی انٹرسیپٹرز کے لیے تقریباً نو ارب ڈالر کا ایک اور بڑا معاہدہ طے پایا

سعودی فضائی دفاع ایک کثیر سطحی نیٹ ورک پر مشتمل ہے جو مختلف فاصلوں، بلندیوں اور رفتاروں کے خطرات سے نمٹنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پیٹریاٹ پی اے سی تھری نظام ہے جو امریکہ میں تیار کیا گیا اور ڈرونز، جنگی طیاروں، کروز میزائلوں اور بعض بیلسٹک میزائلوں کو روکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پیٹریاٹ جدید ریڈاروں کی مدد سے بیک وقت متعدد اہداف کا سراغ لگا سکتا ہے اور انہیں نشانہ بنا سکتا ہے، لیکن اس میں استعمال ہونے والے انٹرسیپٹر میزائل انتہائی مہنگے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض مواقع پر سعودی افواج سوئس ساختہ اور لیکن پینتیس ملی میٹر اینٹی ایئر کرافٹ گنز بھی استعمال کرتی ہیں جو نسبتاً کم لاگت پر چھوٹے ڈرونز کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ تھاڈ نظام جو جولائی 2025 میں سعودی عرب میں فعال ہوا، زیادہ بلندی پر بیلسٹک میزائلوں کو تباہ کرنے کے لیے بنایا گیا ہے اور پیٹریاٹ کے ساتھ مل کر دفاع کی ایک اضافی تہہ فراہم کرتا ہے۔ تاہم تھاڈ خود بھی ایک نہایت مہنگا نظام ہے اور اسے عموماً ڈرونز کے خلاف استعمال نہیں کیا جاتا۔ ان دونوں کے علاوہ آئی ہاک، کروٹال، شاہین، میکا اور مختلف پوائنٹ ڈیفنس سسٹمز بھی موجود ہیں جو مخصوص تنصیبات کے گرد ایک اضافی حفاظتی حلقہ بناتے ہیں۔

ماہرین کے مطابق مسئلہ صرف نظاموں کی موجودگی کا نہیں بلکہ ان کے مؤثر استعمال، آپس میں ہم آہنگی اور وسائل کی تقسیم کا ہے۔ ساسچا بروخمان جو انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار سٹریٹیجک سٹڈیز کے مشرق وسطیٰ سیکشن میں دفاعی اور فوجی تجزیے کے پروگرام سے وابستہ ہیں، کہتے ہیں کہ سعودی فضائی دفاع نے زیادہ تر اہداف کو کامیابی سے روکا ہے، لیکن حوثیوں نے پورے ہفتے مسلسل حملے کیے حتیٰ کہ ہوائی اڈے پر پہلا میزائل گرنے سے پہلے بھی۔ ڈرونز کے جھنڈ اسی مقصد کے لیے تیار کیے جاتے ہیں کہ دفاعی نظام پر بوجھ بڑھا دیا جائے تاکہ کچھ ہتھیار حصار عبور کر جائیں۔ تکنیکی طور پر بعض ڈرونز اتنی کم بلندی اور کم رفتار سے پرواز کرتے ہیں کہ طویل فاصلے تک نگرانی کرنے والے ریڈار انہیں شناخت کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ ایسے ریڈار عموماً تیز رفتار میزائلوں اور جنگی طیاروں کے لیے بہتر بنائے گئے ہوتے ہیں جبکہ ڈرونز کی شناخت کے لیے مخصوص ریڈاروں کی حد نگرانی نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اگر حملہ آور کئی دنوں تک متعدد ڈرون قربان کرنے پر آمادہ ہوں تو وہ ریڈار کوریج میں موجود خلا تلاش کر سکتے ہیں۔

سٹریٹیجک ویژن انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ محقق حماد ولید اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حالیہ حملوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ سعودی فضائی دفاع مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ سعودی عرب کا رقبہ دو ملین مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے اور تیل کی تنصیبات، پائپ لائنز، ہوائی و فوجی اڈے سمیت بڑی تعداد میں حساس مقامات موجود ہیں۔ جدید دفاعی نظام صرف مخصوص علاقوں اور اہم تنصیبات کو تحفظ فراہم کر سکتے ہیں جبکہ حوثی اتنی بڑی تعداد میں حملے کر رہے ہیں کہ بعض میزائل اور ڈرون عبور کر ہی جاتے ہیں۔ یہ وقفے وقفے سے کچھ حملوں کا کامیاب ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ نظام ناکام ہے بلکہ اس کی عکاسی کرتا ہے کہ دفاع مسلسل دباؤ میں ہے۔ حالیہ مہینوں میں سعودی عرب کو نہ صرف حوثیوں بلکہ ایران سے منسلک ڈرونز، کروز اور بیلسٹک میزائلوں سمیت متعدد نوعیت کے خطرات کا سامنا رہا ہے جس سے دفاعی نظام پر مجموعی دباؤ میں اضافہ ہوا۔

تھامس جونو جو چیتھم ہاؤس کے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ پروگرام میں ایسوسی ایٹ فیلو ہیں، دو بنیادی وجوہات بیان کرتے ہیں۔ پہلی سعودی عرب کا وسیع جغرافیہ ہے جہاں اتنے زیادہ حساس مقامات کا مکمل دفاع بذات خود ایک بڑا چیلنج ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ سعودی عرب نے 2025 کے بعد حوثیوں کے خلاف اپنی عسکری کارکردگی میں بہتری لائی ہے، تاہم اسی عرصے میں حوثیوں کی صلاحیتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ حوثی اب صرف پرانے میزائل نہیں بلکہ درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے ایسے بیلسٹک میزائل استعمال کر رہے ہیں جن میں ٹرمینل گائیڈنس موجود ہے اور جو پرواز کے آخری مرحلے میں اپنا راستہ بدل سکتے ہیں یا نچلی پرواز کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ صلاحیتیں انہیں روکنا مزید مشکل بنا دیتی ہیں۔

فابیان ہنز جو کانفلکٹ آرمامنٹ ریسرچ سے وابستہ سینئر تجزیہ کار ہیں، بتاتے ہیں کہ حالیہ رپورٹس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ حوثیوں نے بیلسٹک میزائل، کروز میزائل اور ڈرونز بیک وقت استعمال کیے ہیں۔ اس نوعیت کے مشترکہ حملوں کی منصوبہ بندی آسان نہیں ہوتی کیونکہ ہر ہتھیار کی رفتار، بلندی اور راستہ مختلف ہوتا ہے، لیکن اگر کامیابی سے کیے جائیں تو دفاعی نظام کے لیے اہداف کی نشاندہی اور انہیں تباہ کرنا نمایاں طور پر پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ بیلسٹک میزائل خلا کے کنارے سے آواز کی رفتار سے کئی گنا زیادہ رفتار کے ساتھ آتے ہیں اور دفاعی نظام کو ردعمل کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے۔ کروز میزائل طیاروں کی طرح پرواز کرتے ہیں اور زمین کے نشیب و فراز کے مطابق راستہ اختیار کر سکتے ہیں جبکہ ڈرونز چھوٹے ہوتے ہیں اور اکثر ایسے مواد سے بنے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ریڈار انہیں تلاش کرنا مشکل پاتا ہے۔ بعض ڈرونز اتنی کم رفتار سے اڑتے ہیں کہ ریڈار سافٹ ویئر انہیں غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایران اور حوثیوں نے بڑی تعداد میں ڈرونز کے جھنڈ روانہ کرنے اور انہیں تیز رفتار میزائلوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی مہارت حاصل کر لی ہے تاکہ سب تقریباً ایک ہی وقت میں ہدف تک پہنچیں۔ حماد ولید اس حکمت عملی کو سیچوریشن حملہ قرار دیتے ہیں جس میں پہلے بڑی تعداد میں ڈرونز بھیج کر دفاعی نظام کو مصروف کیا جاتا ہے اور پھر کروز اور بیلسٹک میزائل داغے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ روس کی یوکرین میں اور ایران کی بعض حملوں میں اختیار کی گئی حکمت عملی سے مشابہت رکھتا ہے۔ جب دفاعی نظام بیک وقت بڑی تعداد میں مختلف نوعیت کے اہداف سے نمٹ رہا ہو تو بعض ہتھیاروں کے لیے حصار عبور کرنے کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔

حوثیوں کی صلاحیتوں میں اضافے کا بنیادی عنصر ایرانی معاونت رہا ہے۔ تھامس جونو کہتے ہیں کہ اگر حوثیوں کو برسوں سے ایرانی مدد حاصل نہ ہوتی تو وہ سعودی دفاع میں دراندازی کی موجودہ صلاحیت حاصل نہیں کر سکتے۔ تاہم وقت کے ساتھ حوثیوں نے مختلف ہتھیاروں کی تیاری، اسمبلنگ اور استعمال میں اپنی خودمختار صلاحیتیں بھی بڑھائی ہیں۔ فابیان ہنز کے مطابق حوثیوں نے مختلف اقسام کے ڈرونز، کروز اور بیلسٹک میزائلوں کا ایک متنوع ذخیرہ تیار کیا ہے اور حالیہ برسوں میں درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے ایسے میزائل متعارف کرائے ہیں جن میں ٹرمینل گائیڈنس موجود ہے۔

(باقی صفحہ 15 پر)









دولت، طاقت اور مواقع: پاکستان کہاں کھڑا ہے؟

عالمی دولت کی بڑھتی خلیج اور پاکستان کے لیے اصلاح کا راستہ

رپورٹ کے مطابق 2024 میں دنیا کے ارب پتی افراد کی مجموعی دولت میں تقریباً دو ٹریلین ڈالر کا اضافہ ہوا اور اسی سال 204 نئے ارب پتی سامنے آئے۔ آکسفیم کے تجزیے کے مطابق ارب پتی دولت کا تقریباً 60 فیصد وراثت، اجارہ داری کی طاقت یا بااثر تعلقات سے وابستہ ذرائع سے آتا ہے

ڈاکٹر انعم ناز (سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر نمل یونیورسٹی)

دنیا کی معیشت ترقی کر رہی ہے، دولت کے نئے مراکز وجود میں آ رہے ہیں، ٹیکنالوجی نے پیداوار اور تجارت کے امکانات کو بے مثال وسعت دی ہے؛ مگر اسی دنیا میں ایک بنیادی سوال پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہے: اگر عالمی دولت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے تو پھر غربت اور معاشی محرومی کیوں ختم نہیں ہو رہی؟

اسی سوال کو عالمی سطح پر ایک بار پھر نمایاں کرنے والی رپورٹ کا عنوان ہے: ''The unearned and poverty unjust: Makers not Takers''۔ آکسفیم نے یہ رپورٹ جنوری 2025 میں جاری کی۔ رپورٹ کے مطابق 2024 میں دنیا کے ارب پتی افراد کی مجموعی دولت میں تقریباً دو ٹریلین ڈالر کا اضافہ ہوا اور اسی سال 204 نئے ارب پتی سامنے آئے۔ آکسفیم کے تجزیے کے مطابق ارب پتی دولت کا تقریباً 60 فیصد وراثت، اجارہ داری کی طاقت یا بااثر تعلقات سے وابستہ ذرائع سے آتا ہے۔ یہ اعداد و شمار محض دولت مندوں اور غریبوں کے درمیان فرق کی داستان نہیں؛ یہ اس بڑے سوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ معاشی نظام دولت پیدا کرنے والوں کو کس حد تک انعام دیتا ہے اور دولت پر پہلے سے قابض طبقات کو کس حد تک مزید طاقت فراہم کرتا ہے۔ بجٹ نائیں آکسفیم کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ دنیا میں دولت کی غیر معمولی ارتکاز کی جڑیں صرف موجودہ معاشی فیصلوں میں نہیں بلکہ تاریخ، نوآبادیاتی نظام، عالمی مالیاتی ڈھانچے، اجارہ داریوں اور طاقت کے غیر مساوی تعلقات میں بھی پیوست ہیں۔ یہ ایک ادارے کا تجزیہ ہے، جس کے تمام دعووں کو حتمی معاشی حقیقت سمجھنے کے بجائے اس کے طریقہ کار اور مفروضوں کے ساتھ پڑھنا چاہیے؛ تاہم اس رپورٹ نے عالمی عدم مساوات کے سوال کو ایک بار پھر عالمی بحث کے مرکز میں ضرور لا کھڑا کیا ہے۔

دولت پیدا کرنا اور دولت پر قبضہ کرنا

سرمایہ داری کی اصل روح دولت پیدا کرنے، نئی مصنوعات اور خدمات متعارف کرانے، روزگار پیدا کرنے اور معاشی قدر میں اضافہ کرنے میں ہے۔ ایک کامیاب صنعت کار، برآمد کنندہ، ٹیکنالوجی کمپنی یا کاروباری شخص اگر اپنی صلاحیت، سرمایہ اور جدت سے نئی دولت پیدا کرتا ہے تو اس کا فائدہ صرف اسے نہیں بلکہ ملازمین، صارفین، حکومت اور مجموعی معیشت کو بھی پہنچ سکتا ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دولت پیدا کرنے کے بجائے دولت تک رسائی خود کامیابی کا بنیادی ذریعہ بن جائے۔ اگر کسی شعبے میں چند ادارے مسابقت کو محدود کر دیں، اگر مارکیٹ میں داخلہ مشکل بنا دیا جائے، اگر ریاستی وسائل چند ہاتھوں میں مرتکز ہوں، اگر وراثت نسل در نسل معاشی طاقت منتقل کرتی رہے، یا اگر قانون اور ضابطے سب کے لیے یکساں نہ رہیں تو معیشت میں مسابقت کم اور معاشی ارتکاز زیادہ ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ''Takers'' اور ''Makers'' کا تصور اہم ہو جاتا ہے۔ ایک صحت مند معیشت میں دولت کمانے کا سب سے مضبوط راستہ قدر پیدا کرنا ہونا چاہیے، نہ کہ صرف طاقت، اجارہ داری، رعایت یا تعلقات تک رسائی۔

پاکستان: سوال ہمارے دروازے پر بھی ہے۔

پاکستان اس عالمی بحث سے الگ نہیں۔ عالمی بینک کے حالیہ جائزوں کے مطابق پاکستان میں غربت میں کمی کی رفتار 2015 کے بعد کم زور ہوئی اور 2020 کے بعد مختلف معاشی و قدرتی جھٹکوں نے سابقہ پیش رفت کو متاثر کیا۔ دیہی علاقوں میں غربت شہری علاقوں کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ ہے، جبکہ انسانی سرمائے اور عوامی خدمات میں کم سرمایہ کاری بھی ایک بنیادی چیلنج ہے۔ یہاں مسئلہ صرف یہ نہیں کہ ملک میں کتنی دولت پیدا ہو رہی ہے؛ اصل سوال یہ ہے کہ پیدا ہونے والی دولت کے ثمرات کتنے وسیع طبقے تک پہنچ رہے ہیں۔

پاکستان میں ٹیکس کا مسئلہ بھی اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ IMF کی 2026 کی جائزہ رپورٹ کے مطابق FY2025 میں پاکستان کا ٹیکس ریونیو تقریباً 12.3 فی صد GDP تک پہنچا، جو گزشتہ کئی برسوں کے مقابلے میں بہتری کے باوجود ہم مرتبہ ممالک کے مقابلے میں اب بھی کم ہے۔ IMF نے اس بات کی نشاندہی بھی کی ہے کہ پاکستان کا ٹیکس بیس چند شعبوں تک محدود ہے اور زراعت ایک بڑا کم ٹیکس شدہ شعبہ ہے۔

یہ اعداد ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ریاست اگر وسیع اور منصفانہ بنیاد پر آمدنی جمع نہیں کرے گی تو نہ معیاری تعلیم و صحت فراہم کی جا سکے گی، نہ انفرااسٹرکچر بہتر ہوگا اور نہ ہی کم زور طبقوں کے لیے موثر سماجی تحفظ ممکن ہوگا۔

پاکستان کو کیا کرنا چاہیے؟

مسئلے کا حل محض ''امیر کو غریب کر دو'' یا ''ٹیکس بڑھا دو'' نہیں۔ اصل ضرورت ایسے نظام کی ہے جس میں دولت پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی بھی ہو اور دولت کے غیر منصفانہ ارتکاز کو روکنے کے لیے مضبوط ادارے بھی موجود ہوں۔

پہلا قدم: ٹیکس کا منصفانہ نظام

پاکستان کو ایسا ٹیکس نظام درکار ہے جس میں تنخواہ دار طبقہ مسلسل بوجھ اٹھانے کے بجائے معیشت کے تمام بڑے شعبے اپنی حقیقی استعداد کے مطابق حصہ ڈالیں۔ جائیداد، بڑے تجارتی مفادات، زیادہ آمدنی، منافع اور غیر معمولی معاشی فوائد کو موثر طریقے سے ٹیکس نیٹ میں لانا ضروری ہے۔ تاہم ٹیکس پالیسی ایسی ہونی چاہیے جو پیداواری سرمایہ کاری اور کاروباری سرگرمی کو ختم کرنے کے بجائے غیر پیداواری مراعات اور ٹیکس چوری کو نشانہ بنائے۔

دوسرا قدم: اجارہ داریوں کے خلاف موثر مسابقت

معیشت میں حقیقی مقابلہ صارف کو بہتر قیمت، بہتر معیار اور زیادہ انتخاب فراہم کرتا ہے۔ اس لیے Competition Commission اور دیگر متعلقہ اداروں کو سیاسی یا کاروباری دباؤ سے آزاد، مضبوط اور موثر بنانا ضروری ہے۔ کسی بھی شعبے میں مارکیٹ پر غیر ضروری ارتکاز، innovation اور چھوٹے کاروبار دونوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

تیسرا قدم: چھوٹے اور درمیانے کاروبار کو حقیقی مواقع

پاکستان میں معاشی مواقع کو بڑے کاروباری مراکز تک محدود رکھنے کے بجائے SMEs، نوجوان کاروباری افراد، خواتین اور ٹیکنالوجی پر مبنی نئے کاروباروں کو سستے قرض، تربیت، ڈیجیٹل سہولت اور مارکیٹ تک رسائی فراہم کرنا ہوگی۔ دولت کی وسیع تر تقسیم کا بہترین ذریعہ یہ نہیں کہ ریاست ہر شخص کو امداد دے؛ بلکہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پیداواری معاشی سرگرمی میں داخل ہونے کا موقع دیا جائے۔

چوتھا قدم: انسانی سرمایہ کو قومی سرمایہ سمجھنا ہوگا۔

تعلیم، صحت، غذائیت اور فنی تربیت محض سماجی شعبے کے اخراجات نہیں بلکہ مستقبل کی معاشی پیداوار میں سرمایہ کاری ہیں۔ جب ایک بچہ معیاری تعلیم سے محروم رہتا ہے تو ملک صرف ایک طالب علم نہیں بلکہ مستقبل کا ایک ہنرمند، انجینئر، استاد، ڈاکٹر یا کاروباری شخص کھو دیتا ہے۔

پانچواں قدم: زراعت کو اصلاحات کے دائرے میں لانا ہوگا

پاکستان کی معیشت میں زراعت کی اہمیت کے باوجود اس شعبے سے موثر ٹیکس وصولی اور پیداواری اصلاحات ایک مستقل مسئلہ ہیں۔ عالمی بینک نے بھی حالیہ جائزے میں نشاندہی کی ہے کہ زرعی آمدنی کا بڑا حصہ موثر ٹیکس نظام سے باہر ہے، جب کہ زراعت GDP کا 20 فیصد سے زیادہ حصہ رکھتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ چھوٹے کسان کو غیر ضروری بوجھ سے بچاتے ہوئے بڑے اور زیادہ آمدنی والے زرعی مفادات کو شفاف اور منصفانہ ٹیکس نظام میں لایا جائے۔ ساتھ ہی پانی کے موثر استعمال، جدید ٹیکنالوجی added-Value agriculture اور زرعی برآمدات پر توجہ دی جائے۔

چھٹا قدم: ریاستی اخراجات میں شفافیت

ٹیکس وصول کرنا کافی نہیں؛ عوام کو یہ یقین بھی ہونا چاہیے کہ ان کا پیسہ کہاں خرچ ہو رہا ہے۔ سرکاری خریداری، ترقیاتی منصوبوں، سرکاری اداروں اور عوامی خدمات میں شفافیت اور نتائج کی بنیاد پر نگرانی ضروری ہے۔ اگر عوام ٹیکس دیں مگر انہیں تعلیم، صحت، پانی، ٹرانسپورٹ اور انصاف کی مناسب سہولت نہ ملے تو ٹیکس لیجر مضبوط نہیں ہو سکتا۔

ساتواں قدم: مقامی حکومتوں کو مضبوط کیا جائے

پاکستان میں وسائل کی تقسیم اور عوامی خدمات کی فراہمی کو مقامی سطح تک موثر انداز میں پہنچانا ضروری ہے۔ عالمی بینک کی 2026 کی رپورٹ نے بھی پاکستان کے مالیاتی وفاقیت کے نظام میں اصلاحات، آمدنی میں بہتری اور وفاق، صوبوں اور مقامی حکومتوں کے درمیان بہتر وسائل و ذمہ داریوں کی تقسیم کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اٹلسقشے دیکھیں صرف دولت کی تقسیم نہیں، مواقع کی تقسیم

پاکستان کے لیے سب سے اہم سبق شاید یہی ہے کہ عدم مساوات کا حل صرف دولت چھین کر تقسیم کرنا نہیں، بلکہ مواقع کو وسیع کرنا ہے۔ ایک غریب خاندان کے بچے کو معیاری اسکول، ایک نوجوان کو فنی تربیت، ایک چھوٹے کاروباری کو آسان قرض، ایک کسان کو جدید ٹیکنالوجی، ایک خاتون کو محفوظ معاشی مواقع اور ایک باصلاحیت شخص کو میرٹ پر آگے بڑھنے کا موقع مل جائے تو معاشی عدم مساوات خود بخود کم ہونے لگتی ہے۔ ہمیں ایسی معیشت بنانی ہوگی جہاں امیر ہونا جرم نہ ہو، لیکن امیر ہونے کے لیے نظام کو اپنے حق میں موڑنا بھی ممکن نہ ہو۔

یہ فرق بہت اہم ہے۔

کاروباری کام یابی، سرمایہ کاری، جدت اور دولت پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی ایک ترقی پسند معیشت کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون سب کے لیے یکساں ہو، مارکیٹ میں مسابقت ہو، ریاستی وسائل شفاف طریقے سے استعمال ہوں اور وراثتی یا اجارہ دارانہ طاقت معاشی مواقع کے دروازے بند نہ کر دے۔

''Makers'' کی معیشت

دنیا کو ایسے معاشی نظام کی ضرورت ہے جو دولت پیدا کرنے والوں کو انعام دے، مگر دولت پر قبضے کے راستے محدود کرے۔ پاکستان کے لیے بھی راستہ یہی ہے۔ ہمیں ایسی معیشت درکار ہے جہاں دولت صرف چند خاندانوں، اداروں یا مراکز میں مرتکز نہ ہو بلکہ لاکھوں لوگوں کے لیے نئے مواقع پیدا کرے؛ جہاں ٹیکس نظام منصفانہ ہو؛ جہاں قانون کی حکم رانی معاشی طاقت سے بالاتر ہو؛ جہاں تعلیم اور ہنر سب کے لیے قابلِ رسائی ہوں؛ جہاں اجارہ داری کے بجائے مسابقت ہو؛ اور جہاں ریاست کا کردار کسی مخصوص طبقے کا محافظ بننے کے بجائے منصفانہ معاشی میدان فراہم کرنے والے ادارے کا ہو۔

Oxfam کی رپورٹ کا عنوان ''notTakers Makers'' ایک تلخ سوال ضرور اٹھاتا ہے، مگر پاکستان کے لیے اس کا جواب صرف شکایت نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہماری معیشت کا مستقبل Takers کے لیے مزید مواقع پیدا کرے گا یا Makers کی ایک وسیع، باصلاحیت اور خود انحصار نسل تیار کرے گا۔

ترقی کا اصل پیمانہ یہ نہیں کہ چند افراد کتنے امیر ہوئے؛ اصل کامیابی یہ ہے کہ کتنے لوگوں کو اپنی محنت، صلاحیت اور ہنر سے باعزت زندگی بنانے کا موقع ملا۔O





میری بات

روہیل اکبر

پاکستان کو مقروض ممالک کے عالمی پلیٹ فارم 'باروئرز پلیٹ فارم' (Platform Borrowers) کی گورننگ کونسل کی سربراہی ملنا ملکی معیشت اور عالمی مالیاتی سفارت کاری کے حوالے سے ایک اہم پیش رفت ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب پاکستان کو قرضوں کی ادائیگی، سود کے بڑھتے ہوئے اخراجات، محدود مالی وسائل، بیرونی ادائیگیوں کے دباؤ اور معاشی استحکام جیسے متعدد چیلنجز کا سامنا ہے، اس عالمی فورم کی قیادت پاکستان کو ترقی پذیر ممالک کے مالیاتی مسائل اجاگر کرنے اور قرضوں کے بہتر انتظام کے لیے مشترکہ حکمتِ عملی پر کام کرنے کا موقع فراہم کرسکتی ہے۔ تاہم، اس پیش رفت کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ جانا جائے کہ باروئرز پلیٹ فارم دراصل کیا ہے، اس کے مقاصد کیا ہیں، پاکستان کو اس کی سربراہی سے کیا فوائد حاصل ہوسکتے ہیں اور خود پاکستان کی قرضوں کی صورتِ حال کس نوعیت کی ہے۔

باروئرز پلیٹ فارم کے قیام کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

باروئرز پلیٹ فارم بنیادی طور پر قرض لینے والے ممالک کے درمیان تعاون، معلومات کے تبادلے اور قرضوں کے مؤثر انتظام کے لیے قائم کیا گیا ایک بین الاقوامی فورم ہے۔ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک اپنے قرضوں سے متعلق تجربات، مالیاتی مشکلات اور پالیسیوں کے بارے میں ایک دوسرے سے سیکھ سکیں اور عالمی مالیاتی نظام میں اپنے مسائل کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرسکیں۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک کو اپنے ترقیاتی منصوبوں، بنیادی ڈھانچے، توانائی، تعلیم، صحت اور معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے اندرونی اور بیرونی قرضوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ جب قرضوں کی ادائیگی کے لیے دستیاب آمدن محدود ہو، شرحِ سود بلند ہو یا عالمی معیشت میں غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو ان ممالک کے لیے اپنے ترقیاتی اخراجات اور قرضوں کی ادائیگی میں توازن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک مشترکہ پلیٹ فارم ان ممالک کو اپنی مشکلات سمجھنے، تجربات سے فائدہ اٹھانے اور قرضوں کی پائیداری سے متعلق بہتر پالیسیاں تشکیل دینے میں مدد دے سکتا ہے۔

اس فورم کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ قرض لینے والے ممالک کو اکثر عالمی مالیاتی نظام میں ایسے فیصلوں کے اثرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن پر ان کا براہِ راست اختیار محدود ہوتا ہے۔ عالمی شرحِ سود میں اضافہ، مقامی کرنسی کی قدر میں کمی، درآمدی اخراجات میں اضافہ، برآمدات کی سست رفتار ترقی اور غیر ملکی سرمایہ کاری میں کمی قرضوں کی ادائیگی کو مزید مشکل بنا سکتی ہے۔ باروئرز پلیٹ فارم کا مقصد ان مسائل کے حوالے سے ممالک کے درمیان مکالمے اور تکنیکی تعاون کو فروغ دینا ہے، تاکہ قرض لینے والے ممالک محض انفرادی طور پر مسائل کا سامنا کرنے کے بجائے اپنے تجربات کی بنیاد پر مشترکہ طور پر بہتر حل تلاش کرسکیں۔ اقوام متحدہ کا ادارہ UNCTAD اس پلیٹ فارم کے سیکریٹریٹ کی ذمہ داریاں انجام دیتا ہے، جبکہ اس کا عملی فائدہ اس بات پر منحصر ہوگا کہ رکن ممالک اس کے ذریعے کس حد تک قابلِ عمل تعاون اور مؤثر پالیسی سازی کو آگے بڑھاتے ہیں۔



پاکستان کو سربراہی ملنے کی اہمیت

پاکستان کے لیے اس پلیٹ فارم کی سربراہی ایک ایسا موقع ہے جس کے ذریعے وہ ترقی پذیر ممالک کے قرضوں سے متعلق مسائل پر عالمی سطح پر اپنا کردار ادا کرسکتا ہے۔ پاکستان خود طویل عرصے سے مالیاتی دباؤ، بجٹ خسارے، بیرونی ادائیگیوں کی ضروریات اور قرضوں پر سود کے بھاری اخراجات جیسے مسائل سے دوچار رہا ہے۔ اس تجربے کی بنیاد پر پاکستان قرض لینے والے دیگر ممالک کے ساتھ اپنے عملی تجربات کا تبادلہ کرسکتا ہے اور یہ سمجھنے میں مدد حاصل کرسکتا ہے کہ مختلف ممالک قرضوں کے انتظام، محصولات میں اضافے، ترقیاتی اخراجات کی ترجیحات اور معاشی استحکام کے لیے کون سے طریقے اختیار کررہے ہیں۔ اسی طرح پلیٹ فارم کی قیادت پاکستان کو قرضوں سے متعلق عالمی مباحث میں ترقی پذیر ممالک کی ضروریات اور ترجیحات اجاگر کرنے کا موقع فراہم کرسکتی ہے۔

تاہم، اس سربراہی کو پاکستان کے قرضوں میں فوری کمی یا کسی نئے مالیاتی پیکیج کی ضمانت سمجھنا درست نہیں ہوگا۔ کسی بین الاقوامی فورم کی قیادت سے براہِ راست قرض معاف نہیں ہوتے اور نہ ہی قرض دہندگان کی شرائط خود بخود تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس نوعیت کے فورمز کی افادیت زیادہ تر پالیسی مکالمے، معلومات کے تبادلے، تکنیکی تعاون اور مشترکہ مسائل کی نشاندہی میں ہوتی ہے۔ پاکستان کو اس موقع سے حقیقی فائدہ اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب وہ عالمی سطح پر حاصل ہونے والے تجربات اور تعاون کو اپنی داخلی معاشی اصلاحات کے ساتھ مربوط کرے اور قرضوں کے استعمال، محصولات کی وصولی، برآمدات کے فروغ اور سرکاری اخراجات کے انتظام میں بہتری لانے کے لیے عملی اقدامات کرے۔

پاکستان پر کتنا قرض ہے؟

پاکستان کی معاشی صورتِ حال کا جائزہ لیتے وقت قرضوں کی مجموعی مالیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ وزارتِ خزانہ کے حوالے سے رپورٹ ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق جون 2026 کے اختتام پر پاکستان کا مجموعی سرکاری قرض تقریباً 86.7 ٹریلین روپے، یعنی 86 ہزار 700 ارب روپے تھا۔ اس رقم میں اندرونی اور بیرونی سرکاری قرض شامل ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی رقم ہے، لیکن اس کے معاشی اثرات کو سمجھنے کے لیے صرف مجموعی رقم دیکھنا کافی نہیں؛ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ حکومت کی آمدن کتنی ہے، قرضوں پر سالانہ سود کتنا ادا کیا جارہا ہے، قرضوں کی واپسی کا شیڈول کیا ہے اور ملکی معیشت کتنی رفتار سے ترقی کررہی ہے۔ قرض کا بوجھ اس وقت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب حکومت کی آمدن کا بڑا حصہ سود اور قرضوں کی ادائیگی پر خرچ ہونے لگے اور تعلیم، صحت، ترقیاتی منصوبوں اور عوامی سہولتوں کے لیے دستیاب وسائل محدود ہو جائیں۔

پاکستان کے سرکاری قرضوں میں مقامی قرض کا حصہ بیرونی قرض کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ جون 2026 کے اختتام کے لیے رپورٹ کیے گئے اعداد و شمار میں تقریباً 59.4 ٹریلین روپے مقامی قرض اور 27.3 ٹریلین روپے بیرونی قرض بتایا گیا ہے۔ مقامی قرض میں حکومت کی جانب سے ملکی مالیاتی ذرائع سے حاصل کیے گئے قرض شامل ہوتے ہیں، جبکہ بیرونی قرض غیر ملکی قرض دہندگان اور اداروں سے حاصل کیے گئے قرضوں سے متعلق ہوتا ہے۔ دونوں اقسام کے قرضوں کے معاشی اثرات مختلف ہو سکتے ہیں۔ مقامی قرض پر سود ملکی بجٹ اور مالیاتی نظام پر دباؤ ڈالتا ہے، جبکہ بیرونی قرض کی ادائیگی میں غیر ملکی کرنسی کی ضرورت اہم ہوجاتی ہے۔ اگر پاکستانی روپے کی قدر میں کمی ہو تو بیرونی قرض کی روپے میں مالیت بڑھ سکتی ہے، جس سے حکومت کے لیے اس قرض کی ادائیگی مزید مہنگی ہوجاتی ہے۔

مقامی اور بیرونی قرض میں بنیادی فرق

پاکستان کے قرضوں کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے مقامی اور بیرونی قرض کے فرق کو واضح کرنا ضروری ہے۔ مقامی قرض عموماً حکومت پاکستان کی جانب سے ملکی بینکوں، مالیاتی اداروں، سرمایہ کاروں اور دیگر ملکی ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے۔ حکومت اپنی مالی ضروریات پوری کرنے، بجٹ خسارہ پورا کرنے اور سابقہ قرضوں کی ادائیگی کے لیے مختلف مالیاتی ذرائع استعمال کرتی ہے۔ اس قرض پر ادا ہونے والا سود قومی بجٹ کا ایک اہم خرچ ہوتا ہے۔ جب حکومت کی مالی ضروریات بڑھتی ہیں تو اسے مزید قرض لینا پڑ سکتا ہے، جس کے نتیجے میں سود کی ادائیگیوں کا بوجھ بھی بڑھنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اگر حکومتی قرض گیری ملکی مالیاتی وسائل کا بڑا حصہ استعمال کرنے لگے تو نجی شعبے کے لیے قرض حاصل کرنا نسبتاً مشکل یا مہنگا ہوسکتا ہے، اگرچہ اس کا انحصار شرحِ سود، بینکوں کی مالی حالت اور مجموعی معاشی صورتِ حال پر بھی ہوتا ہے۔

اس کے برعکس بیرونی قرض میں غیر ملکی حکومتوں، عالمی مالیاتی اداروں، کثیر الجہتی ترقیاتی بینکوں اور دیگر بیرونی قرض دہندگان سے حاصل کیے گئے قرض شامل ہوتے ہیں۔ پاکستان کو مختلف ادوار میں عالمی مالیاتی فنڈ، عالمی بینک، ایشیائی ترقیاتی بینک اور دیگر اداروں سے مالی معاونت حاصل ہوتی رہی ہے۔ بیرونی قرضوں کے ذریعے حکومت کو ترقیاتی منصوبوں، زرمبادلہ کی ضروریات اور بیرونی ادائیگیوں کے دباؤ سے نمٹنے میں مدد مل سکتی ہے، لیکن ان قرضوں کی واپسی کے لیے شرائط، مقررہ مدت اور دستیاب غیر ملکی کرنسی کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ملک کی برآمدات، ترسیلاتِ زر اور دیگر بیرونی آمدن اس کی درآمدات اور قرضوں کی ادائیگیوں کی ضروریات کے مقابلے میں کم ہوں تو بیرونی مالیاتی دباؤ میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اسی لیے پاکستان کے لیے صرف مزید قرض حاصل کرنا کافی نہیں، بلکہ بیرونی آمدن بڑھانا، برآمدات میں تنوع پیدا کرنا اور قرضوں کے استعمال کو پیداواری سرگرمیوں سے منسلک کرنا بھی ضروری ہے۔

قرضوں کا بڑھتا ہوا بوجھ معیشت کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

قرضوں کا اصل مسئلہ ان کی مجموعی رقم سے زیادہ اس بات سے متعلق ہے کہ حکومت انہیں کس مقصد کے لیے استعمال کرتی ہے اور ان کی ادائیگی کے لیے وسائل کہاں سے حاصل کرتی ہے۔ اگر قرض ایسے منصوبوں پر خرچ ہو جو مستقبل میں پیداوار، روزگار، برآمدات اور قومی آمدن میں اضافہ کریں تو اس سے معیشت کو طویل مدت میں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر قرضوں کا بڑا حصہ روزمرہ اخراجات، بجٹ خسارے اور سابقہ قرضوں کی ادائیگی میں صرف ہوتا رہے اور معیشت کی پیداواری صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہو تو قرضوں کا بوجھ برقرار رہنے یا بڑھنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پاکستان کے لیے یہ فرق اس لیے اہم ہے کہ حکومت کو بیک وقت قرضوں کی ادائیگی، عوامی خدمات کی فراہمی، ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل اور معاشی استحکام کے تقاضے پورے کرنا ہوتے ہیں۔

قرضوں پر سود کی ادائیگیاں بجٹ میں ایک بڑی مالیاتی ذمہ داری پیدا کرتی ہیں۔ جب ان ادائیگیوں کے لیے زیادہ رقم مختص کرنا پڑتی ہے تو حکومت کے پاس نئے ترقیاتی منصوبوں، تعلیم، صحت، پانی، ٹرانسپورٹ اور دیگر عوامی سہولتوں کے لیے نسبتاً کم وسائل بچ سکتے ہیں۔ اگر حکومت اس فرق کو پورا کرنے کے لیے مزید قرض حاصل کرتی ہے تو مالیاتی دباؤ بڑھنے کا خدشہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹیکسوں کی محدود وصولی، معیشت میں غیر رسمی سرگرمیوں کا بڑا حصہ، سرکاری اداروں کے مالیاتی مسائل اور درآمدات پر انحصار بھی حکومت کی مالی گنجائش کو متاثر کرسکتے ہیں۔ ان مسائل کا پائیدار حل صرف اخراجات میں کمی یا نئے قرضوں کے حصول میں نہیں، بلکہ ٹیکس نظام کی بہتری، سرکاری اخراجات میں شفافیت، برآمدات کے فروغ، سرمایہ کاری میں اضافے اور پیداواری شعبوں کی مضبوطی میں پوشیدہ ہے۔



کیا باروئرز پلیٹ فارم پاکستان کے قرضے کم کرواسکتا ہے؟

پاکستان کو اس عالمی پلیٹ فارم کی سربراہی ملنے کے بعد ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس فورم کے ذریعے پاکستان اپنے قرضوں میں کمی یا قرضوں کی شرائط میں نرمی حاصل کرسکتا ہے؟ (باقی صفحہ 15 پر)

مقروض عالمی ممالک کی سربراہی ایک موقع، لیکن اصل امتحان ملکی معیشت کا!

پاکستان مقروض ممالک کے عالمی پلیٹ فارم کا سربراہ مقرر: 'باروئرز پلیٹ فارم' کیا ہے اور پاکستان خود کتنے قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے؟

مشرق
کرہانی میگزین

ایڈیٹر: ساجد خان

گرافکس: خرم شہزاد

قربتیں ہوتے ہوئے بھی فاصلوں میں قید ہیں
کتنی آزادی سے ہم اپنی حدوں میں قید ہیں



ایمان کامران







قربتیں ہوتے ہوئے بھی فاصلوں میں قید ہیں
کتنی آزادی سے ہم اپنی حدوں میں قید ہیں
ہر طرف آنکھوں میں میرے خواب روشن ہیں ابھی
کتنی نیندیں ہیں جو میرے رتجگوں میں قید ہیں
شہر آبادی سے خالی ہو گئے، خوشبو سے پھول
اور کتنی خوشیاں ہیں جو دلوں میں قید ہیں

پاؤں میں رشتوں کی زنجیریں ہیں، دل میں خوف کی
ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے گھروں میں قید ہیں
کون یہ پاتال سے اُبھرا کنارے پر سلیم
سر پھری موجیں ابھی تک دائروں میں قید ہیں

مشرق
کرہانی میگزین

ایڈیٹر: ساجد خان

گرافکس: خرم شہزاد

قربتیں ہوتے ہوئے بھی فاصلوں میں قید ہیں
کتنی آزادی سے ہم اپنی حدوں میں قید ہیں



ایمان کامران

قربتیں ہوتے ہوئے بھی فاصلوں میں قید ہیں
کتنی آزادی سے ہم اپنی حدوں میں قید ہیں
ہر طرف آنکھوں میں میرے خواب روشن ہیں ابھی
کتنی نیندیں ہیں جو میرے رتجگوں میں قید ہیں
شہر آبادی سے خالی ہو گئے، خوشبو سے پھول
اور کتنی خوشیاں ہیں جو لمحوں میں قید ہیں

پاؤں میں رشتوں کی زنجیریں ہیں، دل میں خوف کی
ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے گھروں میں قید ہیں
کون یہ پاتال سے اُبھرا کنارے پر سلیم
سر پھری موجیں ابھی تک دائروں میں قید ہیں



مصری صدر انور سادات

جب 'اسرائیل کے خلاف فتح' کی فوجی پریڈ کے دوران ان پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی

ستمبر 1981 میں انور سادات نے اپنے مخالفین کے خلاف ایک بڑا سکیورٹی آپریشن شروع کیا، جس میں تمام سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے 1500 سے زائد افراد کو قید کیا گیا۔ اگلے مہینے، 6 اکتوبر کو مسلح افواج کی فوجی پریڈ کے دوران مصری اسلامی جہاد تحریک کے ارکان نے انور سادات کو قتل کر دیا۔







.....میگزین رپورٹ.....

چھ اکتوبر 1981 وہ دن ہے جب قاہرہ میں ایک فوجی پریڈ کے دوران فوجی افسروں کے ایک گروہ نے مصر کے صدر انور سادات کو قتل کر دیا تھا۔ یہ وہ سال تھا جب مصر اور اسرائیل کی قیادت میں عربوں کے درمیان اکتوبر 1973 کی جنگ شروع ہونے کی آٹھویں برسی منائی جا رہی تھی۔ انور سادات یہ سمجھ رہے تھے کہ انھیں اسرائیلی فوج پر فتح حاصل ہوئی اور وہ اس دن کو اپنی فتح کے طور پر دیکھتے تھے۔

انور سادات اپنے قتل سے دو سال قبل اسرائیل کے ساتھ صلح کرنے والے پہلے عرب رہنما تھے۔ اس فیصلے نے بہت سے مصریوں اور عربوں کو ناراض کیا اور ان کے خلاف پرتشدد مظاہروں کا باعث بنا۔

یہ سب معاملہ ہے کیا؟

آغاز

محمد انور سادات 25 دسمبر 1918 کو مصر میں دریائے نیل کے کنارے منوفیہ گورنریٹ کے ایک گاؤں میت ابو الکوم میں پیدا ہوئے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مطابق انور سادات نے 1938 میں قاہرہ کے ملٹری کالج سے گریجویشن کی اور دوسری عالمی جنگ کے دوران انھوں نے جرمنوں کی مدد سے انگریزوں کو مصر سے نکالنے کا منصوبہ بنایا۔

انگریزوں نے انھیں سنہ 1942 میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا لیکن وہ دو سال بعد فرار ہو گئے۔ سنہ 1946 میں انور سادات کو برطانیہ کے حامی وزیر امین عثمان کے قتل میں ملوث ہونے کے الزام کے بعد گرفتار کیا گیا۔ انھیں سنہ 1948 میں بریت کے بعد رہائی ملی۔ سنہ 1950 میں انھوں نے قومی آزادی کی تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ انور سادات 'فری آفیسرز آرگنائزیشن'، جس نے 1952 میں مصری بادشاہت کا تختہ الٹ دیا تھا، کے رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے سنہ 1956 میں صدارت کے لیے جمال عبدالناصر کے انتخاب کی بھی حمایت کی۔

صدارت اور چیلنجز

انور سادات 1964 سے 1966 کے درمیان نائب صدر اور 1969 سے 1970 کے درمیان مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ 28 ستمبر 1970 کو جمال عبدالناصر کی موت کے بعد قائم مقام صدر بنے اور 15 اکتوبر 1970 کو عوامی ریفرنڈم میں صدر منتخب ہوئے۔ انھیں جمال عبدالناصر کے بعد طاقت کے نام نہاد مراکز کی صورت تنہیر اسرائیلی قلعہ بندیوں پر اپنے حملے میں حکمت عملی سے سرپرائز حاصل کیا۔ اگرچہ اسرائیل نے جزیرہ نما سینائی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے مصری پیش قدمی کو پسپا کر دیا، لیکن اسے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

سادات جنگ عرب رہنما کے طور پر کافی اہمیت کے ساتھ ابھرے۔ بین الاقوامی اسٹیج پر ان کا موقف بھی مضبوط ہوا، بہت سے لوگوں نے انھیں ایک قومی ہیرو اور ایک ہوشیار رہنما سمجھا جس نے عرب قوم کا وقار بحال کیا۔ تاہم، یہ جنگ محض ایک فوجی کارروائی نہیں تھی۔ یہ بڑے سفارتی اقدامات کا پیش خیمہ تھا۔

امن

جنگ کے بعد انور سادات نے مشرق وسطیٰ میں امن کے حصول کے لیے کام کیا۔ انھوں نے 19 اور 20 نومبر 1977 کو اسرائیل کا ایک تاریخی دورہ کیا، جس کے دوران انھوں نے اسرائیلی اسمبلی کو اپنا امن منصوبہ پیش کرنے کے لیے یروشلم کا سفر کیا۔ اس سے سفارتی کوششوں کا سلسلہ شروع ہوا جسے انور سادات نے عرب دنیا اور سوویت یونین کے بیشتر ممالک کی شدید مخالفت کے باوجود جاری رکھا۔

امریکی صدر جمی کارٹر نے انور سادات اور مناحم بیغن کے درمیان ہونے والے مذاکرات میں ثالثی کی جس کے نتیجے میں 17 ستمبر 1978 کو کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر دستخط ہوئے جو مصر اور اسرائیل کے درمیان ایک ابتدائی امن معاہدہ تھا۔ انور سادات اور مناحم بیغن کو 1978 میں امن کا نوبل انعام دیا گیا تھا، اور ان کے جاری سیاسی مذاکرات کے نتیجے میں 26 مارچ 1979 کو مصر اور اسرائیل کے درمیان ایک امن معاہدے پر دستخط ہوئے، جو مؤخر الذکر اور کسی بھی عرب ملک کے درمیان پہلا معاہدہ تھا۔

ناراضی اور قتل

مصر اور اسرائیل کے درمیان اس معاہدے کے بعد مغرب میں انور سادات کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ مصر میں معاہدے کی مخالفت، گہرے ہوتے معاشی بحران اور انور سادات کی طرف سے اختلاف رائے کو دبانے کی وجہ سے ان کی ملک میں مقبولیت میں تیزی سے کمی واقع ہوئی۔ ستمبر 1981 میں انور سادات نے اپنے مخالفین کے خلاف ایک بڑا سکیورٹی آپریشن شروع کیا، جس میں تمام سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے 1500 سے زائد افراد کو قید کیا گیا۔ اگلے مہینے، 6 اکتوبر کو مسلح افواج کی فوجی پریڈ کے دوران مصری اسلامی جہاد تحریک کے ارکان نے انور سادات کو قتل کر دیا۔

انور سادات نے فوجی سلامی لی۔ اس کے بعد نامعلوم سپاہی کے مقبرے پر پھولوں کی چادر چڑھائی اور مصری فضائیہ کی نمائش دیکھ رہے تھے جب دو ہینڈ گرنیڈ پھٹ گئے۔ ان دھماکوں کے بعد بندوق بردار اہلکار صدارتی پریڈ کے پلیٹ فارم کے سامنے فوجی ٹرک سے چھلانگ لگا کر شرکا کی طرف بھاگے اور اہلکاروں پر فائرنگ کی۔ اس موقع پر سکیورٹی اہلکاروں کی معمول کی بڑی تعداد کے باوجود عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ حملہ آور ایک منٹ سے زیادہ وقت تک فائرنگ کرتے رہے۔

جس وقت صدر انور سادات کے محافظوں نے جوابی فائرنگ کی تو اس وقت تک 'پوڈیم' کے اندر موجود کم از کم دس افراد شدید زخمی یا ہلاک ہو چکے تھے۔ اس کے بعد سکیورٹی فورسز نے حملہ آوروں میں سے دو کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور باقیوں پر قابو پا لیا جبکہ فوجی اہلکاروں اور عام تماشائیوں کا ہجوم جان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگا۔ صدر انور سادات کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے ملٹری ہسپتال منتقل کیا گیا اور خیال کیا جاتا ہے کہ تقریباً دو گھنٹے بعد ان کی موت ہو گئی۔ حملے کو جس درشتگی کے ساتھ ترتیب دیا گیا اس نے شکوک وشبہات کو جنم دیا ہے کہ حملہ آوروں نے اعلیٰ سطح انٹیلی جنس کی مدد سے یہ سب کیا۔

صدر انور سادات کی موت پر ملا جلا ردعمل سامنے آیا۔

امریکی صدر رونالڈ ریگن نے انور سادات کے قتل کی مذمت کرتے ہوئے اسے گھناؤنا فعل قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ 'امریکہ ایک عظیم دوست سے محروم ہو گیا ہے، دنیا نے ایک عظیم سیاست دان کو کھو دیا ہے اور انسانیت نے امن کے ایک چیمپئن کو کھو دیا ہے۔' لیکن بہت سے لوگوں نے اس خبر پر جشن منایا۔ لیبیا میں ہزاروں لوگ جشن منانے کے لیے دارالحکومت کی سڑکوں پر نکل آئے۔ طرابلس ریڈیو نے اعلان کیا کہ ہر ظالم کا خاتمہ ضروری ہے۔ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن نے بھی اس قتل کی مذمت نہیں کی۔ پی ایل او کے ایک اہلکار نبیل راملاوی نے کہا کہ 'ہمیں صدر انور سادات کی اس انجام کی توقع تھی کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ وہ اپنے لوگوں، عرب اقوام اور فلسطینی عوام کے مفادات کے خلاف کام کر رہے ہیں۔'

سادات کی میراث

انور سادات کی شخصیت انتہائی متنازع رہی۔ کچھ لوگ انھیں ایک قومی ہیرو اور مشرق وسطیٰ میں امن کے علمبردار کے طور پر دیکھتے ہیں، (باقی صفحہ 15)





صورت بڑے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم وہ ان کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ طاقت کے اس ستون کو مصر میں 'اصلاحی انقلاب' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مصر کی معیشت بھی 1967 کی جنگ اور اسرائیل کے خلاف مصری فوج کی شکست کے بعد ابتر حالت میں تھی اور مصری معاشرہ مہنگائی اور بنیادی سہولیات کی کمی کا شکار تھا۔ سنہ 1972 میں انور سادات نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ سوویت یونین انھیں خاطر خواہ مدد فراہم نہیں کر رہا ہے، ہزاروں سوویت تکنیکی ماہرین اور مشیروں کو ملک سے نکال دیا۔

انور سادات نے مصریوں سے وعدہ کیا تھا کہ اسرائیل کے ساتھ امن غیر ملکی سرمایہ کاری کو راغب کرے گا اور خوشحالی لائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ملک کی معاشی مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور غریب اور امیر کے درمیان خلیج بڑھتی گئی۔ کچھ نے انور سادات پر مصر میں بنیاد پرست اسلام کے عروج کی پشت پناہی کا الزام عائد کیا۔ اپنے مخالفین کو کچلنے کے لیے، جن میں سے زیادہ تر سیکولر اور بائیں بازو کی قوتیں تھیں، انھوں نے اسلام پسندوں کی حمایت حاصل کی۔ انور سادات نے اسلامی قانون کو قانون سازی کا بنیادی ذریعہ بنانے کے لیے آئین میں ترمیم بھی کی۔

شام کے سائے تلے

تحریر: بسمیٰ راحت

(قسط نمبر 118)

.....گذشتہ قسط کا آخری پیراگراف)

جن میں سے ایک بری عادت اپنے ہم وطنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خواہش بھی ہے، میں کینیڈا واپس جارہا ہوں، سب لوگوں سے ملاقات کرنا تھی، ابتداء آپ سے کی ہے۔'' اختر بات بنانا جانتا تھا چنانچہ بات نبھا گیا، غلام احمد صاحب کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے، ایک لمحے کے لئے جھجک کا احساس وہا لیکن پھر فطری خودداری ابھر آئی اور انہوں نے دروازے سے ہٹ کر راستہ دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر میں آپ کو اندر آنے کی دعوت بھی دوں گا۔''

''بھی سے آپ کی کیا مراد ہے، آیا اسی لئے ہوں کہ آپ سے کچھ دیر باتیں کروں۔'' اختر نے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے جواب دیا، غلام احمد صاحب اسے لئے ہوئے برآمدے میں پہنچ گئے جہاں نشست کے لئے کچھ کرسیاں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں، ندرت اچانک ہی باورچی خانے سے باہر آئی تھی اور اختر کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ششدر رہ گئی تھی، دوسرے لمحے وہ پھر باورچی خانے میں گھس گئی اس کے ذہن میں کیا تھا اس کا اندازہ مشکل تھا لیکن اختر نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔

(آگے پڑھیئے)

برآمدے کی کرسیوں پر اختر کو بٹھانے کے بعد غلام احمد صاحب خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس اجنبی مہمان سے کیا گفتگو کریں، اختر نے ان کی یہ ہچکچاہٹ محسوس کر کے خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کردیا۔

''دراصل محترم میں انسانی نفسیات پر بھی تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرچکا ہوں اور لوگوں کا تجزیہ میرا شوق ہے، آپ انکل احسان کے ڈرائیور ہیں، معاف کیجئے گا میں طبقاتی فرق کو دنیا کی سب سے گھناؤنی شئے قرار دیتا ہوں، لیکن بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی فطرت میں رچ جاتے ہیں اور جو شخص اپنے پیشے سے ذرا بھی مختلف نظر آتا ہے اس پر حیرت ہوتی ہے، میں نے محسوس کیا ہے محترم کہ آپ کم از کم ذہنی طور پر ڈرائیور نہیں ہیں اس کی وجہ جان سکتا ہوں۔؟''

غلام احمد صاحب کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، انہوں نے کہا ''اختر میاں! آپ ایک ایسے ملک میں قیام پذیر ہیں جہاں جذباتیت کے بجائے حقیقت اور سچائی کو مانا جاتا ہے اور میں ذاتی طور پر اس کا قائل ہوں کہ انسان کو ہمیشہ اپنی حقیقت قبول کرنی چاہیئے، ماضی ایک دلچسپ کہانی کی مانند ہوتا ہے، جو فلم کی طرح نگاہوں سے گزرتی رہتی ہے، اس میں بہت سے الٹ پھیر بھی ہوتے ہیں، لیکن ہمیں حال کا پجاری ہونا چاہیئے، میں اس وقت صرف اور صرف ڈرائیور ہوں اور میرا خیال ہے میری مختصر سی بقیہ زندگی ڈرائیور کی حیثیت سے ہی گزرے گی، ماضی کے بارے میں اگر کچھ جاننا چاہتے ہیں تو اس سے کوئی فائدہ تو نہیں ہوگا، بس یہ کافی ہے کہ تمہاری بڑائی تمہیں اس کوارٹر تک لے آئی ہاں اگر کبھی کسی نے مجھ سے کچھ بڑے آدمیوں کے بارے میں پوچھا تو میں ان میں تمہارا نام ضرور شامل کرلوں گا۔''

''اور یہ الفاظ میری سابات کی تصدیق کرتے ہیں محترم کہ آپ..آپ ماضی میں بہت کچھ رہ چکے ہیں۔''

''لاتعداد انسان ماضی میں بہت کچھ رہ چکے ہیں۔لیکن حال میں کچھ نہیں، جبکہ حال ہی ایک اصل اور ٹھوس حقیقت ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں، تاہم اگر آپ میری یہ خواہش پوری نہیں کرنا چاہتے تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا

''میرے ماضی کے بارے میں جان کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''میں کسی فائدے کے حصول کے لئے آپ کی خدمت میں نہیں حاضر ہوا۔''

''اچھا ٹھیک ہے، بتادوں گا میں اگر اتنی ہی فراخدلانہ طبیعت رکھتے ہیں آپ تو پھر یہ بتایئے کیا پئیں گے اور کچھ پینا پسند کریں گے اس گھر میں

''چائے'' اختر نے جواب دیا۔

''ندرت! مہمان آئے ہیں چائے لے آؤ بیٹے۔'' غلام احمد صاحب نے باورچی خانے کی طرف آواز لگا کر کہا اور اس کے بعد اختر کی جانب متوجہ ہوگئے۔

''ہاں اختر میاں مگر ٹھہرو بھئی نجانے کیوں دل چاہ رہا ہے کہ تم سے ذرا بے تکلفی سے گفتگو کی جائے میرے اہل خانہ سے ملنا پسند کرو گے؟''

''بالکل..اگر آپ اس قابل سمجھیں'' اختر نے جواب دیا اور غلام احمد صاحب نے شوکت جہاں اور اماں بی کو آوازیں دے لیں جو دروازے سے لگی کھڑی تھیں کسی ایسے مہمان کی آمد ان کے لئے حیران کن تھی، وہ دونوں اندر آگئیں، اختر نے دست بستہ انہیں سلام کیا اور غلام احمد صاحب ان کا تعارف کرانے لگے تھے، شوکت جہاں بولیں۔

''ہاں مجھے ان بچوں کی آمد کا علم ہے، احسان صاحب کے بہت گہرے دوست کے بیٹے ہیں کسی نے تذکرہ کیا تھا۔''

''اور اب یہ واپس جارہے ہیں ہم سے ملنے آئے ہیں۔''

''خدا ان کی عمر دراز کرے۔'' شوکت جہاں نے کہا۔

''چچی جان، بعض لوگ مجھ جیسے بھی ہوتے ہیں جو زبردستی کسی کے گھر میں گھس آتے ہیں آپ خیال نہ کیجئے گا''

''نہیں بیٹے، ہم جانتے ہیں کہ اس کوٹھی کے رہنے والے کیسے لوگ ہیں اور اچھے لوگوں کے ساتھی بھی اچھے ہی ہوتے ہیں۔''

''ہاں تو چچا جان آپ مجھے اپنے ماضی کے بارے میں بتارہے تھے۔''

''بھئی مشرقی پاکستان میں آباد تھے ہم لوگ، بس تقدیر نے کچھ فیصلے کئے اور ہم سے وہ علاقہ چھن گیا، وہاں سے بڑی پریشان کن حالت میں یہاں پہنچے، حالات بہت خراب ہوچکے تھے یہاں ملازمت مل گئی، ایک بہت برے علاقے میں رہتے تھے، لیکن احسان صاحب نے احسان کرتے ہوئے ہمیں یہ جگہ بھی دے دی رہنے کے لئے۔اب یہاں مطمئن اور مسرور زندگی گزر رہی ہے



تفسیر شہاب کا جگری دوست تھا، اگر اسے اسٹیشن پر رسیو نہ کیا جاتا تو بگڑ جاتا، اس لئے نجانے کتنے عرصے کے بعد شہاب نے ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھا تھا۔ سیاہ چادر گیٹ سے نکلی، ٹکٹ چیکر جگہ چھوڑ چکا تھا اس لئے گیٹ خالی پڑا تھا

''مشرقی پاکستان میں آپ کا کیا کاروبار تھا؟'' اختر نے مؤدب لہجے میں پوچھا۔

''خاصا بہتر کاروبار تھا، لیکن جب حالات تباہ ہوئے تو میں نے اس کاروبار کو فروخت کردیا، کافی بڑی رقم حاصل ہوئی تھی، لیکن اسے ساتھ لانا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا، چنانچہ انٹرنیشنل ریڈ کراس کے چند نمائندوں کے حوالے اپنا سرمایہ کردیا کچھ ایسی افراتفری پھیلی ہوئی تھی کہ تمام تفصیلات طئے نہ ہوسکیں اور ہم اس سرمائے سے محروم ہوگئے، میں یہ نہیں کہتا کہ ان بیچاروں نے میری تلاش نہ کی ہوگی، میں نے اپنے ذرائع سے کچھ کوششیں بھی کیں اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے، لیکن ان سے رابطہ نہیں ہوسکا، اب تو مایوس ہوگیا ہوں درحقیقت وہ بھی تو میری شناخت میں ناکام رہیں گے، ہاں اگر انفرادی طور پر ان دوافراد سے میرا سامنا ہوجاتا تو شاید وہ مجھے پہچان لیتے اور اس کے بعد میری مشکل حل ہوجاتی، لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔''

''کون لوگ ہیں وہ کم از کم کچھ پتہ تو چلے۔'' اختر نے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔

''ایک خاتون تھیں مسز پال نائیڈو، اور ایک صاحب مسٹر ایلس براؤن تھے انہی دونوں کے حوالے میں نے اپنا سرمایہ کیا تھا لیکن میں نے بین الاقوامی ریڈ کراس سے رابطہ قائم کرکے کوششیں کیں انہوں نے نہایت ہمدردانہ جوابات دیئے لیکن ابھی تک اس سلسلے میں کوئی تسلی بخش بات نہیں پتہ چل سکی۔'' غلام احمد صاحب نے سادہ سے انداز میں کہا

''ہوں بہرطور محترم میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان کو سکون کی زندگی کے لمحات کسی بھی حیثیت سے میسر آجائیں وہ بڑے قیمتی ہوتے ہیں، آپ جس ہمت اور استقلال سے زندگی بسر کررہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔''

کچھ دیر کے بعد ندرت چائے کی ٹرے سجائے ہوئے اندر آگئی، چہرے پر بے پناہ سنجیدگی طاری تھی، اختر نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور غلام احمد صاحب جلدی سے بولے۔

''میری چھوٹی بیٹی ہے ندرت، اس وقت چہرے پر سنجیدگی سجائے ہوئے ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کتنی نٹ کھٹ ہے۔''

''جی'' اختر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''ایک اور بیٹی ہے میری، وہ یونیورسٹی میں اپنی تعلیم مکمل کررہی ہے۔''

اختر نے چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی تھی، تھوڑی دیر تک وہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا اور اس کے بعد غلام احمد کو سلام کرکے وہاں سے باہر نکل آیا، ان لوگوں پر وہ عجیب سا تاثر چھوڑ آیا تھا، اس وقت تین نمبر میں آنے کا مقصد قطعی یہ نہیں تھا کہ غلام احمد صاحب یا ان کے اہل خاندان سے ملاقات کرے، سچی بات تو یہ تھی کہ اس کے قدم ہی اس طرف اٹھ گئے تھے، لیکن اب چونکہ غلام احمد صاحب سے ملا تھا اس لئے دو نمبر کا دروازہ کھٹکھٹانا بھی ضروری تھا تاکہ جو کچھ وہاں کہنا ہے اس کی تصدیق ہوجائے۔

دروازہ بجایا اور ایک منٹ کے بعد جمن کی ماں دروازے پر نظر آئی، اختر کو دیکھ کر وہ سمٹ گئی۔

''کہو میاں کیا بات ہے؟''

''آپ کا مہمان ہوں خالہ جان اسی کوٹھی میں رہتا ہوں اختر ہے میرا نام؟''

''اچھا میاں اچھا، اللہ تمہیں سلامت رکھے، کیسے آنا ہوا جمن تو وہیں اندر رہی ہے، باورچی خانے میں ہوگا کیا اس سے کوئی کام تھا؟''

''نہیں..آپ کو سلام کرنے آیا تھا آخر آپ بھی تو بزرگ ہیں۔''

''اچھا آؤ پھر اندر آجاؤ میاں، وعلیکم السلام..کہو کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں خالہ جان، آپ سنایئے جمن کے بارے میں کچھ بتایئے، جمن تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں، اور میں بھی انہیں..'' اختر نے اندر داخل ہوکر کہا..جمن کی ماں نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور شکایتی انداز میں بولی۔

''ارے کیا بتاؤں اس کمبخت مارے کا حال، دماغ الٹ کر رہ گیا ہے بس بھیا کیسے بتاؤں تمہیں کیا ہوگیا ہے اس مردود کو۔ارے خدا غارت کرے ان تین نمبر والوں کو جنہوں نے میرے جمن کا ستیاناس کرکے رکھ دیا۔''

''اچھا اچھا خالہ جان، بڑا افسوس ہوا یہ سن کر کیا خرابی پیدا ہوگئی جمن میں؟''

''بس بھیا کیا بتاؤں، الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا ہے، تعویذ گنڈوں کے چکر میں پڑ گیا ہے ارے قسمت کی ماری تھی میں جو تین نمبر والوں کو رشتہ دے بیٹھی، سوچا تھا کہ ڈرائیور کی بیٹی سے شادی ہوجائے گی، مگر بھائی کہاں، ان کے تو دماغ ہی ساتویں آسمان پر ہیں جو منع کردیا اور اس کے بعد دشمنی بھی باندھ لی، اب بتاؤ بھیا جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں دشمنی کی کیا ضرورت تھی نجانے کیا کرڈالا ہے میرے جمن کو لیکن اب اللہ کے فضل سے وہ کچھ کچھ ٹھیک نظر آرہا ہے''

''آپ اس کی شادی کیوں نہیں کردیتیں خالہ جان۔'' اختر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں بیٹا اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہوں آج کل، اس کے اوپر سے عشق کا بھوت تو اسی وقت اترے گا جب اس کی شادی کسی اچھی جگہ ہوجائے گی، ارے میں ان تین نمبر والوں پر لعنت بھیجتی ہوں، لڑکیاں ہیں کہ ببول کا درخت کانٹے ہی کانٹے۔'' جمن کی ماں نے بین کرنے والے انداز میں کہا، اختر دلچسپ نگاہوں سے جمن کی ماں کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''اچھا خالہ جان، بس سلام کرنے آیا تھا جارہا ہوں، خدا حافظ۔'' اختر دو نمبر سے نکل آیا۔

اس کے بعد اس میں یہاں رکنے کی سکت نہیں تھی، باہر کا ماحول پہلے کی مانند ہی سنسان تھا، نجانے کیوں کمرے میں جانے کو جی نہیں چاہا اور وہ پائیں باغ کے ایک گوشے میں جا بیٹھا، دل کو واقعی کچھ کچھ ہونے لگا تھا یہاں سے جانے کا تصور تکلیف دہ تھا، طبیعت پر ایک اضمحلال طاری ہوگیا تھا، لیکن جانا تو تھا ہی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے، خالد سے اس بارے میں گفتگو کرسکتا تھا، لیکن کیا یہ گفتگو قبل از وقت نہیں ہوگی، کیا کرے کیا سوچے، کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی، لیکن پھر دفعتہً ہی اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

(جاری ہے)





جی ایچ کیو پر حملہ اور 'ڈاکٹر عثمان' کی گرفتاری

جب فوجی وردیوں میں ملبوس شدت پسندوں کا قیدیوں کو رہا کروانے کا منصوبہ ناکام ہوا

.....میگزین رپورٹ.....

10 اکتوبر 2009 کو دوپہر ہونے کو تھی جب پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد سے ملحق راولپنڈی میں فوج کے جنرل ہیڈکوارٹرز (جی ایچ کیو) کے پہلے حفاظتی حصار پر ایک سفید سوزوکی وین پہنچی۔ گاڑی پر فوجی نمبر پلیٹیں تھیں اور اُس میں سوار افراد فوجی وردیوں میں ملبوس تھے، جن کے پاس خودکار رائفلیں اور دستی بم تھے۔ فوجی نشان لیے اس گاڑی کا وہاں پہنچنا بظاہر غیر معمولی نہیں تھا، لیکن سکیورٹی پر مامور اہلکاروں نے پروٹوکول کے مطابق گاڑی میں موجود افراد کی شناخت چاہی۔ جواب گولیوں کی بوچھاڑ سے ملا جو گاڑی میں سوار افراد کی جانب سے کی گئی تھی۔

گاڑی میں مجموعی طور پر فوجی وردیوں میں ملبوس 10 افراد تھے اور سکیورٹی اہلکاروں کی جوابی فائرنگ کے ابتدائی تبادلے میں اُن میں سے پانچ حملہ آور مارے گئے، لیکن باقی پانچ جی ایچ کیو میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ دیر میں فوج کے مرکزی ہیڈکوارٹرز کے اندر شدید فائرنگ شروع ہو چکی تھی اور عمارت میں موجود چند فوجی افسران اور اہلکاروں کو یرغمال بنایا جا چکا تھا۔ 10 اکتوبر کو شروع ہونے والے اس حملے کے اگلے روز (11 اکتوبر) پاکستانی فوج کے اُس وقت کے ترجمان میجر جنرل اطہر عباس نے صحافیوں کو بتایا کہ حملہ آوروں کی فوجی وردیوں نے سکیورٹی عملے کو ابتدائی لمحوں میں الجھن میں مبتلا کیا اور یہ کہ حملہ آوروں کا ہدف جی ایچ کیو کے اعلیٰ افسران کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے دباؤ ڈالنا تھا۔ برطانوی اخبار 'دی گارڈین' نے 11 اکتوبر 2009 کی اپنی رپورٹ میں لکھا کہ حملہ ایسے وقت ہوا تھا جب پاکستان کی فوج جنوبی وزیرستان میں کالعدم شدت پسند گروہ تحریک طالبان پاکستان کے مضبوط ٹھکانوں کے خلاف بڑے آپریشن کی تیاری کر رہی تھی۔ جی ایچ کیو پر ہوئے اس بڑے حملے سے قبل اسلام آباد میں اقوام متحدہ کی عمارت اور پشاور میں بھی شدت پسندوں کی جانب سے بڑے حملے کیے جا چکے تھے۔

فوج کے ترجمان میجر جنرل اطہر عباس کی جانب سے اُس وقت میڈیا کو فراہم کردہ تفصیل کے مطابق حملہ آوروں نے فوج کے ہیڈکوارٹر پر حملے کی منصوبہ بندی افغانستان کی سرحد سے متصل پاکستان کے شورش زدہ علاقے جنوبی وزیرستان میں کی تھی، جو کالعدم تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے مضبوط گڑھ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ انھوں نے صحافیوں کو بتایا کہ 'اس کارروائی کے لیے بنیادی تربیت جنوبی وزیرستان میں دی گئی تھی۔' اور بعد ازاں ٹی ٹی پی نے اس حملے کی ذمہ داری بھی قبول کی۔

ٹی ٹی پی کے اُس وقت کے ترجمان اعظم طارق نے خبر رساں ادارے 'اے ایف پی' کے نمائندے سے فون پر بات کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ 'ہم جی ایچ کیو پر حملے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ یہ حملہ ہماری پنجاب شاخ نے کیا۔' لیکن اُس وقت بھی بڑا سوال یہ تھا کہ شدت پسند فوج کے ہیڈکوارٹرز تک پہنچے کیسے، اور وہ وہاں کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟

'میران شاہ میں تیار ہونے والا منصوبہ'

اِس حملے کے تقریباً دو برس بعد اخبار 'ایکسپریس ٹریبیون' میں فردِ جرم کے ساتھ سامنے آنے والی فوجی تحقیقاتی دستاویزات اور اخبار 'ڈان' میں عدالتی دستاویزات کے ساتھ شائع ہونے والی ملزم عقیل احمد کے مبینہ اعترافی بیان نے منصوبے کی کئی تفصیلات آشکار کیں۔ انگریزی اخبار 'ڈان' میں 21 ستمبر 2011 کو شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق، ماضی میں فوج کے میڈیکل کور میں نرسنگ اسسٹنٹ رہنے کی وجہ سے 'ڈاکٹر عثمان' کے نام سے جانے والے عقیل احمد کا تعلق پنجاب کے علاقے کہوٹہ سے تھا اور اُن کے شدت پسند گروہوں سے روابط بھی پرانے تھے۔ عقیل احمد جی ایچ کیو میں داخل ہونے والے 10 حملہ آوروں میں شامل تھے اور وہ واحد شدت پسند تھے جو بعد ازاں زندہ حالت میں گرفتار ہوئے تھے۔

'ڈان' اور 'ایکسپریس ٹریبیون' میں شائع ہونے والے عقیل کے اعترافی بیان کی تفصیلات کے مطابق، لاہور میں سری لنکن کرکٹ ٹیم پر مارچ 2009 کے حملے کے بعد وہ شمالی وزیرستان کے علاقے میران شاہ پہنچے، جہاں اُن کی ملاقات تحریک طالبان پاکستان کے امجد فاروقی گروپ کے سربراہ استاد اسلم یا سین اور عسکریت پسند رہنما الیاس کشمیری سے ہوئی تھی۔ عقیل نے اپنے بیان میں دعویٰ کیا کہ جی ایچ کیو پر حملے کا خیال شمالی وزیرستان میں ہوئی اُسی ملاقات میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ابتدا میں وہ فوج کو نشانہ بنانے پر آمادہ نہیں تھے، لیکن الیاس کشمیری اور اسلم یاسین نے دلیل دی کہ 'پاکستان کی فوج امریکہ کی اتحادی ہے، اس لیے اسے ہدف بنایا جانا چاہیے۔' شدت پسندوں کے اس منصوبے کا بنیادی مقصد فوجی افسران کو یرغمال بنانا اور اُن کے بدلے جیلوں میں قید شدت پسندوں کو رہا کروانا تھا۔

فردِ جرم کے مطابق عقیل نے بتایا کہ انھیں 115 افراد کے ناموں کی فہرست دی گئی جن کی رہائی کا مطالبہ کیا جانا تھا۔ حملہ آوروں کو یقین دلایا گیا کہ تربیت یافتہ جنگجو بھی اس کارروائی میں اُن کے ساتھ ہوں گے۔

فوج کے ترجمان اطہر عباس نے بھی حملے کے اگلے روز بتایا تھا کہ دہشت گردوں کے پاس 100 سے زیادہ افراد کی فہرست تھی، جن میں مختلف شدت پسند تنظیموں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔

'گوگل ارتھ سے جی ایچ کیو کی نگرانی'

شمالی وزیرستان میں بننے والا یہ منصوبہ اگست 2009 تک عملی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ عقیل نے راولپنڈی میں پہلے ایک ہاسٹل اور پھر دوسرے مقامات پر عارضی رہائش اختیار کی۔ مختلف رپورٹوں میں بوائز ہاسٹل اور ایک کرائے کے مکان کا ذکر ملتا ہے۔ فوجی تحقیقاتی ریکارڈ کے مطابق، اس نے محمد کامران کے نام سے بھی رہائش حاصل کی تاکہ اپنی شناخت چھپائے رکھ سکے۔ حملے کی تیاری میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ایک اہم پہلو تھا۔

ڈان اور ایکسپریس ٹریبیون کی رپورٹس کے مطابق، عقیل کے اعترافی بیان میں بتایا گیا کہ اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ گوگل ارتھ پر جی ایچ کیو کے نقشے دیکھے اور ہیڈکوارٹر میں موجود عمارتوں، راستوں اور فاصلوں کا جائزہ لیا گیا اور گوگل ارتھ کے فاصلے ناپنے والے ٹول کی مدد سے حملہ آور شدت پسندوں کو راستوں اور مقامات کے بارے میں بریف کیا گیا۔

'ایکسپریس ٹریبیون' کے صحافی مدثر راجا نے 20 ستمبر 2011 کو فوجی تحقیقات کے حوالے سے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ عقیل نے حملے سے پہلے رہائش کے لیے مختلف جگہیں استعمال کیں، جبکہ اسلحے، گاڑی اور دیگر سامان کے انتظامات بھی الگ الگ مراحل میں کیے گئے۔ حملہ آوروں نے ایک سفید سوزوکی وین حاصل کی اور اس پر فوجی نمبر پلیٹیں لگائی گئیں۔

حملے میں استعمال ہونے والی گاڑی عقیل نے 16 ستمبر 2009 کو راولپنڈی میں مری روڈ کے ایک شوروم سے 368,000 روپے میں خریدی تھی۔ فوجی وردیاں بھی مقامی مارکیٹ سے تیار کروائی گئیں۔ اعترافی بیان میں وردیوں کی تیاری پر 30,000 روپے خرچ ہونے کا ذکر تھا۔ اسلحہ اور دھماکہ خیز مواد بھی راولپنڈی منتقل کیا گیا۔ عقیل کے بیان کے مطابق، اسلحے کا ایک حصہ گاڑی میں نصب سی این جی سلنڈر میں چھپا کر لایا گیا تھا۔ اور یوں گاڑی، وردیوں، نقشوں، اسلحے اور مقامی نگرانی پر مشتمل تیاری کئی ہفتوں تک جاری رہی۔

حملہ ابتدا میں چھ اکتوبر کو ہونا تھا، لیکن بعض حملہ آوروں کے بیمار ہونے کے باعث اسے مؤخر کر کے 10 اکتوبر کی تاریخ مقرر کی گئی۔

حملے سے پہلے انتباہ

حملے سے پہلے خطرے کے بارے میں اطلاعات موجود تھیں۔ 'نیویارک ٹائمز' نے 11 اکتوبر 2009 کو رپورٹ کیا کہ پنجاب پولیس کے شعبہ انسدادِ جرائم نے جولائی 2009 میں متعلقہ حکام کو خبردار کیا تھا کہ سری لنکن کرکٹ ٹیم پر لاہور میں حملے سے وابستہ شدت پسند راولپنڈی میں فوجی ہیڈکوارٹرز کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ انٹیلیجنس کی بنیاد پر حاصل ہونے والی اطلاعات میں یہ امکان بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ حملہ آور فوجی وردیوں اور فوجی گاڑیوں کا استعمال کر سکتے ہیں اور افسران کو یرغمال بنانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ پاکستان کے انگریزی اخبار 'دی نیوز' نے پانچ اکتوبر کو اس نوعیت کی پیشگی اطلاع شائع کی تھی۔ پنجاب پولیس کے ایک سینیئر افسر نے بعد میں امریکی اخبار سے گفتگو میں اس انتباہ کی تصدیق بھی کی۔ 'ٹائم' میگزین نے 13 اکتوبر 2009 کی اپنی رپورٹ میں بھی پیشگی انٹیلیجنس اطلاعات کا ذکر کیا۔ اس کے مطابق، حملے کی نوعیت، فوجی وردیوں کے استعمال اور یرغمالیوں کے امکان کے بارے میں پہلے سے خدشات موجود تھے۔

تاہم دستیاب معلومات سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ حملے کے تمام پہلوؤں کی درست پیش گوئی کی گئی تھی یا متعلقہ اداروں کے پاس اس کی مکمل تفصیلات موجود تھیں۔

جی ایچ کیو کے اندر کیا ہوا؟

'ایکسپریس ٹریبیون' میں شائع فردِ جرم کے مطابق عقیل اور اس کے ساتھیوں نے مری روڈ کے راستے جی ایچ کیو پہنچ کر ٹینک چوک کے قریب واقع سکیورٹی چیک پوسٹ پر حملہ کیا۔ حملے کی ابتدا ہی میں پانچ شدت پسند مارے گئے، جبکہ باقی پانچ اندر داخل ہونے میں کامیاب رہے۔ 'وہ ملٹری انٹیلیجنس کے ڈائریکٹوریٹ کی طرف بڑھے۔ اس دوران دو افسروں سمیت فوجی اہلکاروں کو نشانہ بنایا گیا۔ حملہ آوروں نے عمارت میں موجود فوجی اہلکاروں اور سویلین ملازمین کو یرغمال بنا لیا۔' اس وقت فوج کے ترجمان نے ابتدائی طور پر 42 افراد کا ذکر کیا تھا، جبکہ بعض فوجی عدالتی دستاویزات میں مخصوص عمارت یا کمرے میں موجود افراد کی تعداد الگ بیان ہوئی۔ یہ فرق ممکنہ طور پر محاصرے کے مختلف مراحل اور یرغمالیوں کی الگ الگ گنتی سے متعلق تھا۔ حملہ آوروں نے فون کے ذریعے اپنے مطالبات حکام تک پہنچانے کی کوشش کی۔

ڈان اخبار کے مطابق تحقیقاتی حکام نے کورٹ مارشل کی کارروائی کے دوران بتایا کہ عقیل نے ایک یرغمالی کے فون سے اپنے مطالبات پہنچائے۔

عقیل کے اعترافی بیان کے مطابق، مطالبات میں گرفتار عسکریت پسندوں کی رہائی، سابق صدر پرویز مشرف کے خلاف مقدمہ اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی امریکہ سے رہائی جیسے امور شامل تھے۔ تاہم اس نے بعد میں اپنے مطالبات کو قیدیوں کی رہائی تک محدود کر دیا۔ (باقی صفحہ 15 پر)









نانا پاٹیکر

فٹ پاتھ پر سونے سے شہرت کی بلندی تک کیسے پہنچے

اپنی موت کے بارے میں اس بے تکلف انداز میں کہی گئی یہ باتیں نانا پاٹیکر کی صاف گو طبیعت کی عکاسی کرتی ہیں۔













.....میگزین رپورٹ.....

’ایک دن کسی نے مجھ سے پوچھا کہ تم اپنے فارم میں کیا اُگاتے ہو؟ میں نے کہا لکڑیاں۔ میں اپنی ہی لکڑیاں اُگا رہا ہوں۔ ورنہ یہ سارے دوست لوگ مجھے گیلی لکڑیوں سے جلائیں گے۔ دھواں ان کی آنکھوں میں جائے گا، آنکھوں سے پانی نکلے گا اور مجھے جلتے ہوئے لگے گا کہ یہ میرے لیے رو رہے ہیں۔’ یہ بے کار ہیں۔ اس لیے میں اپنے لیے سوکھی لکڑیاں حاصل کروں گا۔ دھواں کم ہوگا۔ پھر مجھے جلتے وقت پتا چلے گا کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔ کیا معلوم، وہاں بھی شاید میں اٹھ کر مسکرانے لگوں۔‘ اپنی موت کے بارے میں اس بے تکلف انداز میں کہی گئی یہ باتیں نانا پاٹیکر کی صاف گو طبیعت کی عکاسی کرتی ہیں۔ سینیئر صحافی نکھل واگلے کو دیا گیا ان کا انٹرویو انھی الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔

نانا پاٹیکر جمعرات کی صبح پانچ بج کر 20 منٹ پر گوا میں وفات پا گئے ہیں۔ وہ ڈونا پاؤلا میں اپنے گھر میں تھے، جو ایک وسیع سمندری ساحل پر واقع ہے۔ انھیں سمندر سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کے بقول جب وہ ساتویں جماعت میں تھے تو ان کی والدہ نے ’یہ سوچ کر کہ بیٹا سدھر جائے گا‘ انھیں اپنی خالہ کے پاس مرود جنجیرا بھیج دیا تھا۔ لیکن جب وہ آٹھویں جماعت میں پہنچے تو ان کی خالہ نے یہ سوچ کر انھیں واپس بھیج دیا کہ ’کہیں یہ دوسری اولاد کو نہ بگاڑ دے۔‘

مرود میں ان کے سامنے ہمیشہ سمندر ہوتا تھا۔ ان یادوں کے بارے میں نانا پاٹیکر نے کہا تھا: ’اسی وجہ سے مجھے ہمیشہ بڑی چیزیں دیکھنے کی عادت پڑ گئی۔ چھوٹی چیزوں سے کبھی دل نہیں لگا۔ لگتا تھا کہ اگر کچھ بننا ہے تو سمندر کی طرح بڑا بننا چاہیے۔‘

’اگر یہ لوگ نہ ملتے تو شاید میں انڈر ورلڈ میں ہوتا‘

نانا پاٹیکر نے نہ صرف ہندی بلکہ مراٹھی فلم انڈسٹری میں بھی اپنا ناقابلِ فراموش نقش چھوڑا۔ وہ ہیرو، معاون ہیرو، ولن اور مختلف نوعیت کے دیگر کرداروں میں نظر آئے اور ان کی شہرت مراٹھی سنیما کی حدود سے کہیں آگے نکل گئی۔ وہ انتہائی غربت سے اوپر آئے تھے۔ اداکاری ہی کی بدولت ایک عام گھر کا لڑکا شہرت کے سمندر تک پہنچ سکا۔

اپنی منفرد شخصیت کے بارے میں بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: ’اس سمندر سے بھی بڑا ایک اور سمندر ہوتا ہے، اور وہ ہے بھوک اور بے قدری۔‘ بچپن میں وہ بہت شرارتی تھے، مگر اپنی اسی توانائی کو انھوں نے تھیٹر اور اداکاری کی طرف موڑ دیا۔

ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا: ’بنیادی طور پر میں ایک غریب آدمی تھا، میں فٹ پاتھ پر سویا ہوں۔ میں 13 سال کی عمر میں ملازمت کرنے لگا تھا، 35 روپے ماہانہ تنخواہ اور ایک وقت کا کھانا ملتا تھا۔ اُس وقت میرا کوئی رشتہ دار نہیں تھا، لیکن جب تھوڑا نام اور پیسہ آیا تو اچانک بہت سے رشتہ دار پیدا ہو گئے۔‘ ان کے والد گجانن پاٹیکر ممبئی میں کپڑے کے کاروبار سے وابستہ تھے۔

کسی نے ان کے والد کو دھوکہ دیا اور خاندان کی جمع پونجی ختم ہوگئی۔ گھر کا بوجھ اٹھانے کے لیے نانا نے پینٹر کی ملازمت کی۔ وہ فلموں کے پوسٹر بھی بناتے تھے۔ وہ دادر کے سمرتھ ودیالیہ میں پڑھتے تھے۔ دوپہر کو گھر آ کر جو ملتا کھا لیتے اور پھر سخت دھوپ میں آٹھ کلومیٹر پیدل چلتے۔ رات کو واپسی پر بھی اتنا ہی فاصلہ طے کرتے۔ روزانہ 16 کلومیٹر پیدل چلنا ان کا معمول تھا۔ ان کا بچپن سخت حالات میں گزرا۔ وہ فوج میں جانا چاہتے تھے لیکن والدین نے اجازت نہیں دی۔ بعد میں فوج کے بارے میں اپنی اسی دلچسپی کو انھوں نے فلم ’پراہار‘ میں پیش کیا۔ بطور ہدایت کار یہ ان کی پہلی فلم تھی، لیکن تھیٹر کی دنیا میں ان کی آمد بھی اتفاقیہ تھی۔

وہ نامور تھیٹر شخصیت اور ہدایت کار وجیا مہتا کو اپنا گرو مانتے تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ وجیا مہتا، اروند دیش پانڈے اور سُلبھا دیش پانڈے جیسے لوگوں نے ان کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی تناظر میں انھوں نے کہا تھا: ’اگر یہ لوگ نہ ملتے تو شاید میں انڈر ورلڈ میں ہوتا۔‘

نانا پاٹیکر کے لیے اشوک صراف ’جان بوجھ کر آٹھ، دس روپے ہار جاتے تھے‘

نانا پاٹیکر ملازمت سے تھیٹر کی دنیا میں کس طرح آئے، اس بارے میں بھی وہ ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ اُس زمانے میں ’چھنگنا‘ نامی ڈرامے کی ریہرسل دیکھنے جایا کرتے تھے۔ جب ایک اور ڈرامہ تیار کیا جا رہا تھا تو سُلبھا تائی نے اروند دیش پانڈے سے کہا: ’وہ جولڑکا ہے نا، وہ یہ کردار ادا کرے گا۔‘

اس وقت نانا پاٹیکر ملازمت کر رہے تھے، اس لیے وہ تذبذب کا شکار تھے کہ نوکری جاری رکھیں یا اداکاری کی طرف آئیں۔ لیکن سُلبھا تائی کے اعتماد اور جو کردار انھیں دیا گیا، اس کی بدولت نانا کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کے لیے ایک بڑا پلیٹ فارم مل گیا۔

نانا پاٹیکر بتاتے ہیں کہ ڈرامہ ’پُرُش‘ سے نسبتاً زیادہ آمدنی ہوتی تھی، اسی لیے وہ کئی برس تک اس میں کام کرتے رہے۔ اُس زمانے میں ہر شو کے عوض نانا پاٹیکر کو 50 روپے ملتے تھے جبکہ اشوک صراف (معروف اداکار) کو 200 روپے، یعنی اُن سے چار گنا زیادہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ نانا پاٹیکر کے مطابق جب اشوک صراف اُن کے ساتھ تاش کھیلتے تھے تو وہ جان بوجھ کر آٹھ دس روپے ہار جایا کرتے تھے۔ نانا کہتے ہیں: ’مجھے پتا ہوتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ہار رہے ہیں، لیکن پھر بھی میں وہ پیسے لے لیتا تھا کیونکہ مجھے ان کی ضرورت تھی۔‘ اشوک صراف اور نانا پاٹیکر کے درمیان تعلقات کتنے بے تکلف تھے، یہ بات نانا پاٹیکر نے ایک انٹرویو میں خود بیان کی۔

نانا پاٹیکر کہتے ہیں: ’اشوک نے میری بہت مدد کی، بہت زیادہ۔ وہ کنپٹی کے موقع پر بھی مجھے خاص طور پر پیسے دیا کرتے تھے۔ جب میں وہ واپس کرنے جاتا تو اشوک ہنس کر کہتے، کیوں پاٹیکر، کیا آپ مالدار ہو گئے ہیں؟ میں انھیں کہتا کہ میں صرف پیسے واپس کر سکتا ہوں، وہ وقت نہیں لوٹا سکتا جو آپ نے میرے لیے صرف کیا۔ ’ان لوگوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ میں اشوک کے پاؤں دباتا تھا اور ان کے سر کی ہلکی سی مالش کر دیتا تو وہ مجھے تین روپے دے دیتے تھے۔

’آج بھی جب کہیں اشوک سے ملاقات ہوتی ہے اور میں ان کے پاؤں دبانے لگتا ہوں تو وہ جھڑک کر کہتے ہیں کہ یہ سب کیا ہے؟

’اس پر میں انھیں کہتا ہوں، یہ ہماری آمدنی کا ذریعہ ہے۔ ’پھر دو منٹ ان کے سر کی مالش کرتا ہوں تو وہ پانچ یا 10 روپے دیتے ہوئے مذاق میں کہتے ہیں، چلو لے لو، لے لو، مہنگائی بڑھ گئی ہے، مزے کرو!‘

جب نانا پاٹیکر نے اشوک صراف کے لیے رکشہ چلایا

دوسری جانب اشوک صراف نے بھی نانا پاٹیکر کے بارے میں ایک ایسا ہی واقعہ اپنی کتاب ’بہروپی‘ میں بیان کیا ہے۔ ڈرامہ ’حمیدہ بائی کی کوٹھی‘ کے ایک شو کے دوران نہ صرف اشوک صراف بلکہ پوری ٹیم کو ایک انتہائی پُرتشدد صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ شو ایک دور دراز قصبے میں ہو رہا تھا جہاں باقاعدہ معنوں میں کوئی تھیٹر موجود نہیں تھا۔ فنکاروں نے سٹیج پر اداکاری شروع کی، لیکن نہ تو ناظرین کو کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ پانچ منٹ کے اندر نوبت ڈرامہ منسوخ کرنے تک آ گئی۔ باہر لوگ غصے میں شور مچا رہے تھے۔

چونکہ اشوک صراف ایک معروف اور مقبول فنکار تھے، اس لیے باہر موجود ہجوم کا سارا غصہ انھی کی طرف مرکوز تھا۔

صورت حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے نانا پاٹیکر، جو اس ڈرامے میں بھی کام کر رہے تھے، اشوک صراف کا ہاتھ پکڑ کر انھیں عقبی راستے سے باہر لے گئے۔ ادھر تھیٹر کے اندر ہاتھا پائی بھی شروع ہو چکی تھی۔

اشوک صراف نے لکھا: ’ہم دونوں سڑک تک پہنچ گئے۔ وہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نانا نے ایک سائیکل رکشہ روکا۔ مگر عمر رسیدہ رکشہ چلانے والے کے لیے چڑھائی والا راستہ طے کرنا مشکل تھا۔ نانا نے سائیکل والے کو نیچے اتارا اور خود رکشہ کھینچنے لگے۔ ’اگر نانا نہ ہوتے تو لوگ یقیناً مجھے مار دیتے۔ ڈرامہ نہ ہو سکنے کا سارا غصہ وہ مجھ پر نکالتے۔ آج بھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔‘

جنسی ہراسانی کے الزامات سے ’نام فاؤنڈیشن‘ تک

نانا پاٹیکر نے نہ صرف مراٹھی بلکہ ہندی فلم انڈسٹری میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ انھوں نے 1978 میں ریلیز ہونے والی فلم ’گمن‘ سے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ تاہم اس فلم میں ان کا کردار اتنا مختصر تھا کہ وہ ناظرین کی خاص توجہ حاصل نہ کر سکے۔ بعد ازاں انھوں نے پرندہ، کرانتی ویر، پراہار، خاموشی، اگنی ساکشی، نٹسمرت اور ویلکم جیسی متعدد فلموں میں اپنی اداکاری کے ذریعے گہرا اثر چھوڑا۔

2014 میں آنے والی فلم ’پرکاش بابا آمتے‘ سے انھیں خاصی مقبولیت ملی۔ اسی طرح ’نٹسمرت‘ میں ان کی اداکاری کو بھی بہت سراہا گیا، جبکہ فلم ’دیول‘ میں ان کے کردار پر آج بھی سوشل میڈیا پر میمز بنائی جاتی ہیں۔ ہندی فلموں پر ندہ، انگار، کرانتی ویر اور اپہرن کے لیے انھیں فلم فیئر ایوارڈز بھی ملے۔

خاص طور پر انھوں نے نا انصافی کے خلاف آواز اٹھانے والے ایک شدید جذباتی اور باغی مزاج کردار، یعنی ’اینگری ینگ مین‘ کو اپنے منفرد انداز میں پردہ سکرین پر پیش کیا۔

شاید اسی لیے راج ٹھاکرے نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ: ’نانا کی اداکاری کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا تھا جیسے عام آدمی کی زندگی میں جذبات کا ایک پریشر کُکر دیکھ رہے ہوں۔‘ تاہم نانا پاٹیکر کی زندگی بھی اتار چڑھاؤ سے بھرپور رہی۔ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ زیرِ بحث آنے والا تنازع جنسی ہراسانی کے وہ الزامات تھے جو ان پر عائد کیے گئے تھے۔ اداکارہ تنوشری دتہ نے 2008 میں ایک فلم کے سیٹ پر نانا پاٹیکر پر جنسی انداز سے چھونے کا الزام لگایا۔ اس فلم میں دونوں ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔

نانا پاٹیکر نے ان الزامات کی ہمیشہ تردید کی۔ 2018 میں انڈیا میں ’می ٹو‘ تحریک کے آغاز کے بعد یہ معاملہ دوبارہ منظرِ عام پر آیا۔ بعد ازاں تنوشری دتہ نے پولیس میں شکایت درج کروائی، (باقی صفحہ 15 پر)



مقصود خالد
بیورو چیف لاہور

روس کا دوہرا دورہ: کابل اور اسلام آباد میں نیر شکن اور کولوکولتسیف کی آمد

کیا ماسکو پاکستان-افغانستان کشیدگی کا ثالث بن سکتا ہے؟

سب سے پہلے داخلی سطح پر ٹی ٹی پی کے خلاف جامع اور مستقل کارروائی جاری رکھنی ہوگی تاکہ یہ پیغام جائے کہ پاکستان اپنی سلامتی کے معاملات میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرے گا۔ دوسرا، سفارتی سطح پر کثیر جہتی رابطے بڑھانے ہوں گے جن میں روس، چین، ترکی، قطر، سعودی عرب اور دیگر ممالک شامل ہوں۔

تیسرا، طالبان حکومت کے ساتھ براہ راست اور بالواسطہ چینلز کو فعال رکھنا ہوگا تاکہ غلط فہمیاں کم ہوں۔ چوتھا، سرحدی علاقوں میں مقامی سطح پر اعتمادسازی کے اقدامات جیسے مشترکہ مارکیٹیں، ثقافتی تبادلوں اور انسانی امداد کے پروگرام شروع کیے جاسکتے ہیں۔





شہباز شریف، چیف آف ڈیفنس سٹاف جنرل عاصم منیر اور دیگر اہم رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ یہ کسی بھی روسی وزیر داخلہ کا پہلا سرکاری دورہ پاکستان تھا۔

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کی تاریخ پیچیدہ اور اکثر عدم اعتماد سے بھری رہی ہے۔ ڈیورنڈ لائن کا تنازع، پشتونستان کا مسئلہ، سوویت حملے کے دوران پاکستان کا کردار، طالبان کی پہلی حکومت، امریکی حملے کے بعد کے دو دہائیوں کا پیچیدہ تعامل اور 2021 میں طالبان کی واپسی نے اعتماد کی بنیادوں کو بار بار متزلزل کیا ہے۔ موجودہ کشیدگی کی جڑیں خاص طور پر ٹی ٹی پی کے بڑھتے ہوئے حملوں میں ہیں۔ پاکستان کا موقف ہے کہ ٹی ٹی پی کے جنگجو افغان سرزمین پر محفوظ پناہ گاہیں استعمال کر رہے ہیں اور طالبان حکومت ان کے خلاف موثر کارروائی نہیں کر رہی۔ طالبان حکومت اس الزام کی تردید کرتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ کسی بھی گروہ کو پاکستان کے خلاف استعمال ہونے نہیں دے گی۔

سرحدی جھڑپیں، تجارت میں رکاوٹیں اور سفارتی زبان میں تلخی نے تعلقات کو ایک نئے نشیب پر پہنچا دیا ہے۔

روس کی افغانستان میں دلچسپی تاریخی اور تزویراتی دونوں پہلو رکھتی ہے۔ سوویت دور کی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہوئے آج کا روس زیادہ محتاط اور کثیر جہتی سفارتکاری اپنا رہا ہے۔ روس دنیا کا واحد بڑا ملک ہے جس نے طالبان حکومت کو باضابطہ طور پر تسلیم کیا ہے۔ رواں سال جولائی میں طالبان حکومت نے روس کے ساتھ سکیورٹی تعاون کے معاہدے کا اعلان کیا جو روسی فوجی ساز و سامان کی دیکھ بھال سے متعلق ہے۔ روس نے طالبان کے فوجی وفد کو 2026 کی فوجی مشقوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھی مدعو کیا۔ یہ پیش رفتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ماسکو طالبان حکومت کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کر چکا ہے اور اس کے ساتھ عملی تعاون بڑھانا چاہتا ہے۔

نیر شکن کا پس منظر اس دورے کی اہمیت کو مزید واضح کرتا ہے۔ وہ اپنے کیریئر کے بیشتر حصے میں صدر پوتن کے قریب رہے ہیں اور روسی صدر کے سیاسی و نظریاتی موقف کو تاریخی بنیادیں فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ان کا کابل کا دورہ محض سفارتی ملاقات نہیں بلکہ انٹیلیجنس سطح پر براہ راست رابطہ سمجھا جا رہا ہے جسے مبصرین روس اور طالبان کے درمیان سکیورٹی تعاون کو مزید گہرا کرنے کی کوشش قرار دے رہے ہیں۔

قائداعظم یونیورسٹی کے ڈاکٹر خرم اقبال کے مطابق یہ محض افغانستان اور روس کے دوطرفہ تعلقات کا معاملہ نہیں۔ نیر شکن کا دورہ ایسے وقت میں ہوا جب روسی وزیر داخلہ بھی پاکستان کے دورے پر تھے، جس سے لگتا ہے کہ ماسکو بیک وقت اسلام آباد اور کابل کے ساتھ اپنے روابط کو متحرک کر رہا ہے۔ امکان ہے کہ روس پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدگی کم کرنے یا ثالثی کرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ تاہم ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا دونوں ممالک کی ترجیحات واقعی ایک جیسی ہیں؟ روس کی بنیادی توجہ داعش خراسان (آئی ایس آئی ایس-کے) پر مرکوز ہے جبکہ ٹی ٹی پی کے معاملے پر ماسکو نسبتاً کم حساس دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہ گروہ براہ راست صرف پاکستان کو نشانہ بناتا ہے۔

ٹی ٹی پی اور آئی ایس آئی ایس-کے کے درمیان فرق صرف نظریاتی نہیں بلکہ عملی بھی ہے۔ ٹی ٹی پی پاکستان کے خلاف براہ راست جنگ لڑ رہا ہے جبکہ آئی ایس آئی ایس-کے طالبان حکومت، وسط ایشیائی ریاستوں اور روس کے لیے خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر روس صرف آئی ایس آئی ایس-کے پر توجہ مرکوز رکھے اور ٹی ٹی پی کے معاملے میں کم فعال رہے تو پاکستان کے لیے اس ثالثی کا فائدہ محدود ہوسکتا ہے۔

سوشل میڈیا اور تجزیہ کاروں میں بھی مختلف آرا سامنے آئیں۔ کچھ اسے مثبت ثالثی کے طور پر دیکھتے ہیں جبکہ دوسرے خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ افغانستان ایک مرتبہ پھر علاقائی اور عالمی طاقتوں کی پراکسی جنگ کا میدان بن سکتا ہے۔ تاریخی طور پر افغانستان بڑی طاقتوں کی رقابت کا میدان رہا ہے۔ آج جب امریکہ کی براہ راست فوجی موجودگی ختم ہوچکی ہے تو روس، چین، ایران، ترکی، قطر اور پاکستان اپنی اپنی ترجیحات کے ساتھ میدان میں موجود ہیں۔ روس کا موجودہ انداز سوویت دور کی براہ راست مداخلت سے مختلف ہے اور زیادہ سفارتی، انٹیلیجنس اور اقتصادی تعاون پر مبنی ہے۔

اعتمادسازی کے عمل میں تین بنیادی عناصر شامل ہیں۔ پہلا باہمی الزام تراشی سے اجتناب اور حقیقت پسندانہ تشخیص۔ دوسرا عملی سکیورٹی تعاون جیسے سرحدی نگرانی، انٹیلیجنس شیئرنگ اور متفقہ کارروائی۔ تیسرا اقتصادی اور انسانی روابط جیسے تجارت کی بحالی، پناہ گزینوں کی منظم واپسی اور ثقافتی تبادلے۔

روس اس عمل میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے کیونکہ اس نے طالبان حکومت کو تسلیم کیا ہے اور پاکستان کے ساتھ بھی تاریخی روابط ہیں۔ تاہم کامیابی اس بات پر منحصر ہوگی کہ وہ دونوں فریقوں کے جائز تحفظات کو یکساں وزن دے۔ ترکی اور قطر کی حالیہ سرگرمیاں بھی اسی تناظر میں اہم ہیں جنھوں نے طالبان حکام سے ملاقاتیں کیں۔

حکمت عملی کے لحاظ سے پاکستان کو داخلی سطح پر ٹی ٹی پی کے خلاف جامع کارروائی جاری رکھنی ہوگی، سفارتی سطح پر کثیر جہتی رابطے بڑھانے ہوں گے اور طالبان حکومت کے ساتھ براہ راست چینلز فعال رکھنے ہوں گے۔ افغانستان کی جانب سے بھی ٹی ٹی پی جیسے گروہوں کے خلاف عملی اقدامات ضروری ہیں جو نہ صرف تعلقات بہتر بنائیں گے بلکہ طالبان حکومت کی داخلی استحکام کو بھی مضبوط کریں گے۔

طویل المدتی نقطہ نظر سے خطے کو ایک جامع سلامتی فن تعمیر کی ضرورت ہے جس میں دہشت گردی کے خلاف مشترکہ جدوجہد، منشیات کی اسمگلنگ کا خاتمہ، پانی کے وسائل کا منصفانہ استعمال اور اقتصادی رابطہ کاری شامل ہوں۔ موجودہ صورتحال میں داخلی سیاست، بیرونی مداخلت، اقتصادی مشکلات اور معلومات کی جنگ جیسے چیلنجز موجود ہیں لیکن امکانات بھی ہیں۔ دونوں ممالک دہشت گردی کے شکار ہیں اور استحکام دونوں کے مفاد میں ہے۔

نیر شکن اور کولوکولتسیف کے دورے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ روس خطے کی سلامتی کے معاملات میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اگر ماسکو حقیقی معنوں میں متوازن کردار ادا کرے تو یہ پاکستان-افغانستان تعلقات کی بحالی میں مثبت کردار ثابت ہوسکتا ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کی بحالی نہ صرف دونوں ممالک بلکہ پورے خطے کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔ بہتر حکمت عملی، مستقل مشاورتی عمل، اعتماد سازی کے اقدامات اور روس کا متوازن کردار اس بحالی کو ممکن بنا سکتا ہے۔ تاریخ نے بار بار ثابت کیا ہے کہ افغانستان میں عدم استحکام پورے خطے کو متاثر کرتا ہے۔ اس لیے تمام متعلقہ فریقوں کو طویل المدتی مفادات کو قلیل المدتی حساب کتاب پر فوقیت دینی چاہیے۔

☆.....☆







اعتمادسازی کے عمل میں تین بنیادی عناصر شامل ہیں۔ پہلا باہمی الزام تراشی سے اجتناب اور حقیقت پسندانہ تشخیص۔ دوسرا عملی سکیورٹی تعاون جیسے سرحدی نگرانی، انٹیلیجنس شیئرنگ اور متفقہ کارروائی۔ تیسرا اقتصادی اور انسانی روابط جیسے تجارت کی بحالی، پناہ گزینوں کی منظم واپسی اور ثقافتی تبادلے۔

اور افغان طالبان حکام کے درمیان اتفاق رائے نہ ہونے کے باعث مشترکہ اعلامیہ جاری نہ ہوسکا۔ یہ پیش رفت محض دوطرفہ روابط کی معمول کی توسیع نہیں بلکہ خطے میں روس کے بڑھتے ہوئے کردار، علاقائی استحکام کی تلاش اور پاکستان-افغانستان تعلقات کی بحالی کے امکانات پر گہرے سوالات اٹھاتی ہے۔

نیر شکن کا دورہ ایسے موقع پر سامنے آیا جب طالبان حکومت کے ساتھ روس کے سیاسی، سفارتی اور سکیورٹی روابط تیزی سے گہرے ہو رہے ہیں۔ طالبان کے زیر انتظام نیشنل افغانستان ٹی وی کے مطابق نیر شکن نے طالبان انٹیلیجنس چیف عبدالحق وثیق اور دیگر اعلیٰ حکام سے ملاقاتیں کیں جن میں باہمی تعلقات کے فروغ اور انٹیلیجنس تعاون پر بات ہوئی۔ یہ دورہ ماسکو فارمیٹ کے اجلاس کے فوراً بعد ہوا جہاں روسی وزیر خارجہ سرگئی لاروف نے واضح طور پر کہا تھا کہ روس پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے اور کشیدگی کم کرنے کے لیے ثالثی کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ اسی دوران روسی وزیر داخلہ کولوکولتسیف پاکستان میں تھے جہاں انھوں نے وزیر اعظم

(بقیہ: حوثی میزائلوں اور ڈرونز نے سعودی حصار کیسے توڑا؟)

خیبر شکن سلسلے کے جدید میزائل پرواز کے آخری مرحلے میں بچاؤ کی چالیں اختیار کر سکتے ہیں اور نچلی پرواز کا راستہ لے سکتے ہیں۔ حالیہ تحقیقات سے یہ بھی سامنے آیا ہے کہ حوثی اب چینی ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہوئے ایرانی خیبر شکن میزائل کی مقامی تیاری کی طرف بڑھ رہے ہیں جو ان کی صلاحیتوں میں ایک بڑی چھلانگ ہے۔

سعودی دفاعی نظام کی کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف سینسر اور ریڈار ایک دوسرے سے مکمل طور پر مربوط نہیں ہوتے۔ ساسچا برومان کہتے ہیں کہ حقیقی معنوں میں کثیر سطحی دفاع تب ہی ممکن ہے جب مختلف عسکری اداروں کے ریڈاروں سے حاصل ہونے والی معلومات کو ایک مرکزی فضائی دفاعی آپریشنز سینٹر میں یکجا کیا جائے۔ اس کے لیے جدید سافٹ ویئر، کمپیوٹنگ صلاحیت، پلیٹ فارمز کے درمیان مطابقت اور اداروں کے درمیان قریبی تعاون درکار ہوتا ہے۔ یہ صرف سعودی عرب کے لیے نہیں بلکہ ہر ملک کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ حماد ولید مزید کہتے ہیں کہ سعودی عرب کو صرف یمن سے نہیں بلکہ ایران اور کسی حد تک عراق کی جانب سے بھی ممکنہ خطرات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے اس لیے وسائل کو مختلف محاذوں پر تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ انٹرسیپٹر میزائل محدود تعداد میں ہوتے ہیں اور انہیں دوبارہ بھرنے میں وقت لگتا ہے۔ حالیہ علاقائی کشیدگی کے دوران بڑی تعداد میں انٹرسیپٹر استعمال ہو چکے ہیں جس سے ذخائر کو بھرنا ایک اہم چیلنج بن گیا ہے۔

تھامس جونو اس تنازع کو غیر متناسب قرار دیتے ہیں جس میں حوثیوں کو صرف کبھی کبھار کامیابی درکار ہوتی ہے جبکہ سعودی عرب کو تقریباً ہر حملے کو روکنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اگر دفاعی نظام زیادہ تر میزائلوں اور ڈرونز کو تباہ بھی کر دے تو چند ہتھیاروں کا عبور کر جانا ہی حوثیوں کو اپنے بعض مقاصد حاصل کرنے کا موقع فراہم کر سکتا ہے۔ حماد ولید کہتے ہیں کہ یمن کے حوثیوں کے زیر کنٹرول علاقے پہاڑی اور دشوار گزار ہیں جہاں فضائی کارروائیاں پیچیدہ ہو جاتی ہیں اور مؤثر کارروائی کے لیے زمینی انٹیلی جنس اور بعض صورتوں میں زمینی موجودگی بھی اہم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے گزشتہ برسوں کی مسلسل فضائی کارروائیوں کے باوجود حوثیوں کی بعض صلاحیتیں ختم نہیں ہوئیں بلکہ ترقی کرتی رہیں۔

حوثیوں کے میزائل اور ڈرون حملے تقریباً ایک دہائی سے جاری ہیں اور ماضی میں ریاض، الخبیق اور دیگر اہم تنصیبات بھی ان کا نشانہ بن چکی ہیں۔ حالیہ حملوں کا جائزہ لیتے وقت یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ سعودی عرب کو ایران سے منسلک خطرات کا بھی سامنا رہا ہے اور حوثیوں اور ایران کے درمیان عسکری روابط کے بارے میں متعدد رپورٹس سامنے آ چکی ہیں اگرچہ ایران اس دعوے کو مسترد کرتا ہے۔ طویل مدت میں سعودی عرب کو امریکی تعاون کے ساتھ یمن میں حوثی مخالف قوتوں کو مضبوط کرنا ہوگا تاکہ حوثیوں پر مؤثر عسکری دباؤ ڈالا جا سکے۔ قلیل مدت میں فضائی دفاعی نظام، انٹرسیپٹر ذخائر اور ان کے مؤثر استعمال کو بہتر بنایا جا سکتا ہے لیکن صرف دفاعی صلاحیتوں میں اضافہ حوثیوں کے خطرے کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

دنیا کا کوئی بھی فضائی دفاعی نظام سو فیصد مؤثر نہیں ہوتا۔ جدید ترین نیٹ ورکس کو بھی یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ہر ہدف کے خلاف کتنے انٹرسیپٹر استعمال کیے جائیں اور دستیاب وسائل کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔ سعودی عرب کا کیس اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی، اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری اور کثیر سطحی دفاع بھی اس وقت ناکافی ثابت ہو سکتے ہیں جب دشمن مسلسل بدلتی ہوئی حکمت عملی، سستی مگر بڑی تعداد میں ہتھیار اور غیر متناسب جنگ کا راستہ اختیار کرے۔ ۱۰ اور ۱۱ اکتوبر کے حملے اسی حقیقت کی ایک اور تلخ یاد دہانی ہیں۔

☆.....☆

(بقیہ: پاکستان کو مقروض عالمی ممالک کی سربراہی ایک موقع)

اس کا جواب یہ ہے کہ پلیٹ فارم براہِ راست قرض معاف کرنے یا قرض دہندگان کو کسی خاص رعایت پر مجبور کرنے کا اختیار رکھنے والا ادارہ نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ اس کا بنیادی کردار قرض لینے والے ممالک کے درمیان تعاون اور قرضوں سے متعلق پالیسی مکالمے کو فروغ دینا ہے۔ تاہم، اگر پاکستان اس فورم کو مؤثر انداز میں استعمال کرے تو وہ قرضوں کی پائیداری، ادائیگیوں کے دباؤ، ترقیاتی مالی معاونت اور قرض دہندگان کے ساتھ بہتر رابطے جیسے موضوعات پر اپنا نقطہ نظر پیش کر سکتا ہے۔ اس طرح پاکستان کو دوسرے ممالک کے تجربات سے فائدہ اٹھانے اور عالمی مالیاتی مباحث میں اپنی ضروریات کو اجاگر کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

قرضوں کی شرائط میں تبدیلی، ادائیگیوں کی مدت میں توسیع، شرحِ سود میں رعایت یا قرضوں کی تنظیمِ نو کے لیے متعلقہ قرض دہندگان کے ساتھ الگ مذاکرات اور ان کی منظوری درکار ہوتی ہے۔ باروئرز پلیٹ فارم ان مذاکرات کا متبادل نہیں، البتہ یہ ممالک کو اپنے تجربات اور پالیسی ترجیحات مرتب کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ پاکستان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس فورم میں محض نمائندگی تک محدود نہ رہے بلکہ قرضوں کے بہتر انتظام، مالیاتی شفافیت، ترقیاتی سرمایہ کاری اور بیرونی مالی ضروریات سے متعلق عملی تجاویز پر کام کرے۔ عالمی سطح پر حاصل ہونے والا تعاون اسی وقت زیادہ مفید ثابت ہوگا جب اس کے ساتھ ملک کے اندر معاشی اصلاحات بھی جاری رہیں۔

پاکستان کے لیے آگے کا راستہ کیا ہے؟

پاکستان کی معیشت کو قرضوں کے دباؤ سے نکالنے کے لیے ایک جامع اور طویل مدتی حکمتِ عملی درکار ہے۔ سب سے پہلے حکومت کو محصولات میں اضافے کے لیے ٹیکس نظام کو زیادہ مؤثر، شفاف اور منصفانہ بنانا ہوگا، تاکہ مالیاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے بار بار قرض لینے پر انحصار کم کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ سرکاری اخراجات کی ترجیحات کا ازسرِ نو جائزہ، غیر ضروری اخراجات میں کمی، سرکاری اداروں کی مالی کارکردگی میں بہتری اور ترقیاتی منصوبوں کی مؤثر نگرانی بھی اہم ہے۔ ایسی معاشی پالیسیوں کی ضرورت ہے جو صنعت، زراعت، معدنیات، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور دیگر پیداواری شعبوں میں سرمایہ کاری کو فروغ دیں۔ پاکستان کے پاس معدنی وسائل، زرعی صلاحیت، نوجوان افرادی قوت اور برآمدات بڑھانے کے امکانات موجود ہیں، لیکن ان امکانات کو حقیقی آمدن میں تبدیل کرنے کے لیے بنیادی ڈھانچے، مہارتوں، توانائی کی دستیابی، کاروباری ماحول اور پالیسیوں میں تسلسل پر توجہ دینا ضروری ہے۔

اسی طرح بیرونی قرضوں کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے برآمدات میں اضافہ اور زرمبادلہ کے مستحکم ذرائع پیدا کرنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ملک کی برآمدات میں اضافہ ہو، مقامی صنعت زیادہ مسابقتی بنے اور درآمدی متبادل پیدا کرنے والی سرگرمیوں کو فروغ ملے تو بیرونی ادائیگیوں کے توازن کو بہتر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے صرف وقتی اقدامات کافی نہیں ہوں گے؛ کاروباری لاگت میں کمی، ٹیکنالوجی کی منتقلی، صنعتی پیداوار میں بہتری اور عالمی منڈیوں تک رسائی کو بھی اہمیت دینا ہوگی۔ قرضوں کے استعمال میں شفافیت، ہر بڑے منصوبے کے متوقع معاشی فوائد کا جائزہ اور قرض کی واپسی کی صلاحیت کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے، تاکہ مستقبل میں حاصل ہونے والے قرض موجودہ مالیاتی مسائل کو مزید پیچیدہ کرنے کے بجائے قومی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔

سربراہی کو بذاتِ خود معاشی کامیابی یا قرضوں میں کمی کا ثبوت قرار نہیں دیا جا سکتا؛ اس کی حقیقی افادیت کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ پاکستان اس فورم سے حاصل ہونے والے تعاون کو کتنی مؤثر انداز میں اپنی مالیاتی حکمتِ عملی اور ترقیاتی ترجیحات میں شامل کرتا ہے۔

بالآخر پاکستان کے لیے سب سے اہم ہدف یہ ہونا چاہیے کہ قرضوں کو معاشی ترقی کا ذریعہ بنایا جائے، نہ کہ مستقل مالیاتی انحصار کی بنیاد۔ اگر حکومت محصولات میں اضافہ، برآمدات کے فروغ، پیداواری صلاحیت میں بہتری، اخراجات کی مؤثر نگرانی اور قرضوں کے ذمہ دارانہ استعمال پر توجہ دے تو قرضوں کے بوجھ کو بتدریج قابلِ برداشت بنانے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ باروئرز پلیٹ فارم کی سربراہی اس سفر میں تعاون، تجربات اور عالمی رابطوں کا ایک ذریعہ بن سکتی ہے، لیکن پاکستان کی طویل مدتی معاشی بہتری کا انحصار بالآخر اس کی اپنی پالیسیوں، ادارہ جاتی کارکردگی اور عملی اقدامات پر ہوگا۔

☆.....☆

(بقیہ: مصری صدر)

جبکہ دوسرے انھیں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر تقسیم کرنے والی شخصیت کے طور پر۔ اس کے باوجود یہ بات ناقابل تردید ہے کہ ان کی میراث نے مصر اور عرب دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بین الاقوامی سطح پر انور سادات کو ان رہنماؤں میں شمار کیا جاتا ہے جنھوں نے مشرق وسطیٰ کا چہرہ بدلنے میں کردار ادا کیا۔ انھوں نے اسرائیل کے ساتھ جو امن معاہدہ کیا وہ محض دو طرفہ معاہدہ نہیں تھا۔ انھوں نے عرب ریاستوں اور اسرائیل کے درمیان تعلقات میں ایک نئے دور کا آغاز کیا حالانکہ یہ تعلقات کئی سال بعد تک مکمل طور پر آگے نہیں بڑھ پا رہے تھے۔

کچھ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ تاریخ نے عرب اسرائیل تنازع کے بارے میں انور سادات کے نقطہ نظر کی تصدیق کی ہے۔ ان کے قتل کے ایک عشرے سے زیادہ بعد فلسطینی امن قائم کرنے کے طویل اور مشکل راستے پر گامزن ہوئے۔ اس کے بعد اردن، جنھوں نے اسرائیل اور پھر متحدہ عرب امارات، مراکش، سوڈان اور بحرین کے ساتھ امن قائم کیا۔ انور سادات نے سیاسی اور اقتصادی اصلاحات کے ذریعے مصر کی ترقی کا سفر جاری رکھا۔ یہ وہ اصلاحات تھیں جو انھیں اپنے پیشرو جمال عبدالناصر سے وراثت میں ملی تھیں۔ انور سادات نے اپنی معاشی اور سماجی پالیسیوں کے ذریعے مصر پر اپنے گہرے نشانات چھوڑے۔ اگرچہ ان کی پالیسیوں میں خامیاں بھی تھیں مگر یہ مصری معیشت کو جدید بنانے اور غیر ملکی سرمایہ کاری کے دروازے کھولنے کی کوشش تھی۔

انور سادات کے سب سے اہم مقامی سطح پر اٹھائے گئے اقدامات میں سے ایک سرمایہ کاری کی راہ ہموار کرنا تھا۔ ان کی اس پالیسی کو 'انفتاح' کہا جاتا ہے۔ یہ بنیادی اقتصادی تبدیلی کا ایک پروگرام تھا جس کے ذریعے معیشت میں تنوع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تجارت اور غیر ملکی سرمایہ کاری کو راغب کرنے کی کوششیں شامل تھیں۔ معیشت کو آزاد کرنے کے لیے انور سادات کی کوششوں کے مصر پر کچھ منفی اثرات بھی مرتب ہوئے جن میں بلند افراط زر، دولت کی غیر مساوی تقسیم، اور بڑھتی ہوئی عدم مساوات، جس کے بعد جنوری 1977 میں مصر میں فسادات شروع ہوئے۔

انور سادات نے مصریوں سے وعدہ کیا تھا کہ اسرائیل کے ساتھ امن غیر ملکی سرمایہ کاری کو راغب کرے گا اور خوشحالی لائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ملک کی معاشی مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور غریب اور امیر کے درمیان خلیج بڑھتی گئی۔

کچھ نے انور سادات پر مصر میں بنیاد پرست اسلام کے عروج کی پشت پناہی کا الزام عائد کیا۔ اپنے مخالفین کو کچلنے کے لیے، جن میں سے زیادہ تر سیکولر اور بائیں بازو کی قوتیں تھیں، انھوں نے اسلام پسندوں کی حمایت حاصل کی۔ انور سادات نے اسلامی قانون کو قانون سازی کا بنیادی ذریعہ بنانے کے لیے آئین میں ترمیم بھی کی۔

سرد جنگ کے دوران دیگر علاقائی اور بین الاقوامی طاقتوں کی طرح انور سادات نے سیاسی اسلام کا استعمال اپنے مخالفین پر حملہ کرنے کے لیے کیا۔ ایک بار جن بوتل سے باہر آ گیا تو اسے دوبارہ اندر ڈالنا مشکل تھا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سادات کو قتل کرنے والے ان کے بائیں بازو کے خلاف جنگ میں ان کے سابق اتحادی تھے، اور انھوں نے انھیں اس لیے مارا کہ انھوں نے اپنے دشمن ملک اسرائیل سے صلح کر لی تھی۔ انور سادات کے قتل کے بعد جن بہت سے مشتبہ افراد کو قید کیا گیا ان میں ایمن الظواہری نام کے ایک نوجوان مصری ڈاکٹر بھی شامل تھے۔ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد انھوں نے عالمی جہاد کی صفوں میں شامل ہونے کے لیے مصر چھوڑ دیا۔ سنہ 2022 میں انکی موت تک انکا شمار القاعدہ کے چوٹی کے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔

☆.....☆

(بقیہ: جی ایچ کیو پر حملہ اور 'ڈاکٹر عثمان' کی گرفتاری

اس دوران فوج نے عمارت اور اس کے اطراف کا محاصرہ کر لیا۔ 10 اکتوبر کی پوری رات کشیدگی برقرار رہی اور مذاکرات کے ساتھ ساتھ یرغمالیوں کو چھڑانے کے لیے آپریشن کی تیاریاں بھی جاری رہیں۔

کیمروں میں محفوظ ہونے والا چہرہ

حملے کی تحقیقات میں جی ایچ کیو کے نگرانی کے کیمروں کی ریکارڈنگ اہم ثابت ہوئی۔ 'ڈان' میں چھپی عدالتی دستاویزات کے مطابق جی ایچ کیو میں سکیورٹی افسر (ٹیکنیکل) میجر اختر حسین قمر نے سی سی ٹی وی پر پورا واقعہ دیکھا اور عقیل احمد کی شناخت کی۔ انھوں نے بیان دیا کہ 'میں نے سی سی ٹی وی پر پورا واقعہ دیکھا اور مشاہدہ کیا کہ 10 حملہ آور سوزوکی وین سے ٹینک چوک کی چوکی کے قریب اُترے۔' 'انھوں نے چوکی اور وہاں موجود بعض سکیورٹی اہلکاروں پر حملہ کیا۔ ان میں سے پانچ حملہ آور نشانہ بنے، جب کہ باقی پانچ جی ایچ کیو کے احاطے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے اس پورے واقعے کی اطلاع اپنے اعلیٰ حکام کو دی۔' 'بعد ازاں، میں نے ایس ایس جی کے اہلکاروں اور فوجی دستوں کو جوابی کارروائی کی منصوبہ بندی اور دہشت گردوں کی شناخت میں مدد دی، کیونکہ ملزم نمبر 1 (عقیل احمد) کے خدوخال فوٹیج میں بالکل واضح تھے۔'

انگریزی اخبارات میں شائع ہونے والے عقیل کے اعترافی بیان کے مطابق، اگلی صبح سپیشل سروسز گروپ کے کمانڈوز نے عمارت میں کارروائی شروع کی تو عقیل دوسرے حملہ آوروں سے الگ ایک جگہ موجود تھا اور فون پر مذاکرات کر رہا تھا۔ کمانڈوز نے باقی حملہ آوروں کو ہلاک کر کے یرغمالیوں کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس دوران عقیل ایک دفتر میں چھپ گیا اور بعد میں اُس وقت باہر نکلا جب عمارت کے ایک حصے کے ملبے تلے پھنسے لوگوں کو نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ شاید وہ وہاں سے فرار ہو جاتا، مگر اسے پہچان لیا گیا کیونکہ جی ایچ کیو کے کیمروں میں اس کا چہرہ واضح طور پر محفوظ تھا۔

میجر جنرل اطہر عباس کے مطابق، یرغمالیوں کو چھڑانے کے لیے کی جانے والی کارروائی، جسے 'آپریشن جانباز' کا نام دیا گیا، میں دو کمانڈوز جان سے گئے اور تین دیگر بعد میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے۔ ابتدائی فائرنگ کے تبادلے کے بعد باقی بچ جانے والے پانچ حملہ آوروں میں سے چار سکیورٹی فورسز کے آپریشن کے دوران مارے گئے، جبکہ عقیل زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔

جی ایچ کیو کا یہ محاصرہ تقریباً 18 گھنٹے جاری رہا۔ آئی ایس پی آر کی جانب سے اس وقت فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق جی ایچ کیو پر حملے اور شدت پسندوں کے خلاف جوابی کارروائی میں مجموعی طور پر فوج کے 11 اہلکار اور افسر جان سے گئے۔

اسلحہ اور معاونین کا نیٹ ورک

حملے کے بعد مختلف مقامات پر چھاپوں اور گرفتاریوں کے ذریعے اس منصوبے کی مزید تفصیلات بھی سامنے آئیں۔ پولیس نے اس مکان پر چھاپا مارا جہاں حملہ آوروں کے قیام کا شبہ تھا۔ مکان کے مالک کو گرفتار کیا گیا اور اس وقت شائع ہونے والی رپورٹس کے مطابق وہاں سے فوجی وردیاں، اسلحہ اور دیگر سامان برآمد ہونے کی اطلاعات سامنے آئیں۔ دیواروں پر فوج مخالف تحریروں کا ذکر بھی تحقیقاتی رپورٹ میں کیا گیا۔ عقیل نے اپنے اعترافی بیان میں حملے کی تیاری میں متعدد افراد کے کردار کا ذکر کیا۔

بعد ازاں ہونے والی تحقیقات میں سپاہی عمران صدیق اور شہری واجد محمود پر حملہ آوروں کی معاونت اور جی ایچ کیو کی سکیورٹی و آمد و رفت کے راستوں کی نگرانی میں مدد دینے کے الزامات عائد کیے گئے۔ واجد محمود نے ان مقامات کی نشاندہی کی جہاں اعلیٰ فوجی افسران موجود ہو سکتے تھے۔ حملے کے دوران عقیل نے ایک جیپ ڈرائیور کو بھی مبینہ طور پر اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب اس نے فوجی کے اعلیٰ افسران کے دفاتر کے مقامات بتانے سے انکار کیا تھا۔ مقدمے میں دیگر شہریوں کے نام بھی سامنے آئے، جن پر اسلحے کی فراہمی، نقل و حمل یا منصوبہ بندی میں معاونت کے الزامات تھے۔

'ایکسپریس ٹریبیون' نے 20 ستمبر 2011 کو فوجی چارج شیٹ کی بنیاد پر رپورٹ کیا کہ حملے کے سلسلے میں گرفتار افراد کے خلاف کارروائی فیلڈ جنرل کورٹ مارشل میں ہوئی۔ 11 اگست 2011 کو عقیل کو سزائے موت سنائی گئی، جبکہ اس کے معاونین کو مختلف مدت کی قید کی سزائیں دی گئیں۔ اسی رپورٹ میں حملہ آوروں سے برآمد ہونے والے اسلحے کی فہرست بھی شامل تھی، جس میں نور رائفلیں، ایک راکٹ لانچر، بھری اور خالی میگزینیں، دستی بم، کلیمور مائنز، راکٹ، ڈیٹونیٹر اور 40 ملی میٹر کے گرینیڈ شامل تھے۔

یہ ذخیرہ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ حملہ آور صرف مختصر فائرنگ کر کے فرار ہونے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ اُن کے پاس طویل محاصرے اور مسلح مزاحمت کے لیے بھی اسلحہ موجود تھا۔

سزائے موت پر عملدرآمد

عقیل اور اس کے ساتھیوں کے خلاف فوجی عدالت کی کارروائی کے بعد مقدمے کا قانونی مرحلہ کئی برس تک جاری رہا۔ اپیلوں میں بھی سزائے موت برقرار رہی، لیکن اس پر فوری عملدرآمد نہیں ہو سکا کیونکہ پاکستان میں سزائے موت پر عملدرآمد کا وقفہ تھا۔ پھر 16 دسمبر 2014 کو پشاور کے آرمی پبلک سکول پر شدت پسندوں کے حملے میں بچوں سمیت 140 سے زیادہ افراد کی ہلاکت کے بعد حکومت نے سزائے موت پر عائد پابندی ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈان نے 20 دسمبر 2014 کو رپورٹ کیا کہ جی ایچ کیو حملے کے مرکزی ملزم عقیل احمد عرف 'ڈاکٹر عثمان' اور سابق فوجی ارشد محمود کو فیصل آباد جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ ارشد محمود سابق فوجی حکمران پرویز مشرف پر قاتلانہ حملے کے مقدمے میں سزائے موت کے مجرم تھے۔

☆.....☆

(بقیہ: نانا پاٹیکر)

جس کے بعد نانا پاٹیکر منفی تناظر میں خبروں کا حصہ بنے رہے۔ تاہم پولیس کو الزامات کی تائید کے لیے کافی شواہد نہ مل سکے اور جون 2019 میں انھیں اس الزام سے بری کر دیا گیا۔

نانا پاٹیکر نے نیوز چینل 'مرر ناؤ' کو ایک انٹرویو میں ان الزامات کو مسترد کرتے ہوئے کہا تھا: 'جنسی ہراسانی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ہم ایک فلم کے سیٹ پر تھے اور ہمارے سامنے 200 لوگ موجود تھے۔'

2015 میں مہاراشٹر میں قحط کی سنگین صورتحال کے پیش نظر نانا پاٹیکر نے اداکار مکرند انا سپورے کے ساتھ مل کر 'نام فاؤنڈیشن' قائم کی تھی۔ اس فاؤنڈیشن کا مقصد مہاراشٹر میں خشک سالی سے متاثرہ علاقوں اور مشکلات کا شکار کسانوں کی مدد کے لیے عملی اقدامات کرنا تھا۔

'میں قرآن کی آیات بھی پڑھتا ہوں'

نانا پاٹیکر پر اکثر یہ تنقید کی جاتی تھی کہ وہ مختلف نظریات رکھنے والے لوگوں سے یکساں تعلقات رکھتے تھے اور کسی نظریے پر واضح مؤقف اختیار نہیں کرتے تھے۔ وہ مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے بھی قریب سمجھے جاتے تھے۔

ایک انٹرویو میں ان سے سوال کیا گیا: 'بابا آمتے بھی آپ کے قریب ہیں اور بال صاحب ٹھاکرے بھی آپ کے قریب ہیں، یہ کیسے ممکن ہے؟' شاید اس سوال کے جواب میں نانا پاٹیکر نے جو بات کہی، اس سے ان کی اس مبینہ 'تنوع پسند' طبیعت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ نانا نے کہا: 'مجھے جو اچھا لگتا ہے، وہ اچھا لگتا ہے۔ میں ایک پرندہ ہوں۔ مجھے کس شاخ پر بیٹھنا ہے، اس کا فیصلہ میں خود کرتا ہوں۔' آگے چل کر اسی تناظر میں وہ کہتے ہیں: 'سبھی اچھے ہوتے ہیں۔'

'میں قرآن کی آیات بھی پڑھتا ہوں، میرے گلے میں تعویذ بھی ہے۔ کرشنا بھی ہیں۔ یہ سب میں خود سے نہیں پہنتا، بلکہ کسی نے دیا ہے اس لیے پہنتا ہوں۔' میں مندر نہیں جاتا۔ میں شیردی (انڈیا کی ریاست مہاراشٹر کا قصبہ، جو صوفی بزرگ سائیں بابا کے مزار کی وجہ سے مشہور ہے) وغیرہ بھی نہیں جاتا۔ اگر مجھے سائیں بابا کے درشن کرنے ہوں تو میں یہیں ہاتھ جوڑ سکتا ہوں، اور اگر وہ واقعی خدا ہیں تو وہ یہاں بھی آ سکتے ہیں۔ منطق تو اتنی ہی سادہ ہے۔'

مکالمہ: جعفر ترین (کوئٹہ)

ڈاکٹر عصمت درانی ان شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جن کے تعارف کے لئے کسی ایک شعبے کا حوالہ کافی نہیں۔ وہ بنیادی طور پر ماہرِ اطفال اور معالج ہیں، لیکن ان کی شناخت صرف طب تک محدود نہیں۔ اردو اور پشتو کے شاعر، نثر نگار، نقاد اور صاحبِ مطالعہ دانش ور کی حیثیت سے بھی انہوں نے اپنی ایک الگ جگہ بنائی ہے۔

عصمت درانی پشتو اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں اور کمال کی شاعری کرتے ہیں۔ اردو مجموعوں میں آئینے میں چراغ، دھوپ کی آواز، نرسلوں میں ہوا، انگاروں میں پھول اور پھر نئی شاعری کے ساتھ ان سبھی کا مجموعہ کلیات اردو ''دریا کوئی گیت گا رہا ہے'' اسی طرح پشتو میں ژاغونہ بلیوی، اوبہ خڑی وڑی کیوی، مرغہ الوزی لہ شاخہ، ڈیوے کوچ کوی لہ تاخہ، پھر ان سبھی کی کلیات ''پہ دے کانڑو کی غمی دی'' پشتو کلیات پ536 صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو کلیات 656 صفحات پر مشتمل۔ اسی طرح نثر میں بھی ان کی چھ کتابیں چھپی ہیں جن کا مجموعہ شش جہات کے نام سے ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے یعنی شش جہات میں ان ان کی نثری تحریروں کے چھ مجموعوں کو یکساں کر کے چھاپا گیا ہے۔

نثری تحریروں کے مجموعے شش جہات میں چھ کتابیں شامل ہیں۔ شش جہات کے ساتھ ان کی ایک انگریزی کتاب بھی ہال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ The fire of my soul کے نام سے۔ دی فائر آف سول عصمت درانی کے منتخب اردو اور پشتو نظموں کا منظوم انگریزی ترجمہ ہے۔

عصمت درانی کی جوانی میں نے نہیں دیکھی مگر اب وہ عمر کے جس حصے میں ہیں ان کی بھنویں تک سفید ہونے لگی ہیں اور اس عمر میں بھی بہت وجیہہ اور پرکشش شخصیت ہے ان کی۔ گھنی داڑھی اور گھنی مونچھیں، سر کے بال بھی ماشاءاللہ سے کوئٹہ کی آب و ہوا کے برخلاف کافی گھنے البتہ اب نہ صرف سر کے بال اور داڑھی بلکہ بھنویں بھی سفید ہو رہی ہیں جب بات کرتے ہیں اور اچانک سے فضاء کو تکتے ہوئے آپ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کی گہری ابھری ہوئی بھنویں

ڈاکٹر عصمت درانی کی شاعری میں ذاتی کیفیت کے ساتھ اجتماعی تجربہ بھی جگہ بناتا ہے۔ محبت ہو، تنہائی ہو، معاشرتی بے سمتی ہو یا انسان کے اندر کی کشمکش، ان کے ہاں یہ سب الگ الگ خانوں میں نہیں رہتے۔

عجیب سا اساطیری تاثر قائم کرتی ہیں۔ دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے ہیں۔

گزشتہ دنوں مشرق سنڈے میگزین کے لئے ڈاکٹر عصمت درانی سے ایک خصوصی نشست ہوئی۔ گفتگو کا دائرہ ادب، شاعری اور صحافت سے نکل کر معاشرے کی بدلتی قدروں، نئی نسل، زبانوں کے مستقبل، گلوبلائزیشن، تخلیقی آزادی اور ہمارے اجتماعی رویوں تک پھیل گیا۔ نشست رسمی سوال و جواب سے زیادہ ایک ایسی مکالماتی گفتگو بن گئی جس میں کبھی ماضی کا کوئی دریچہ کھلتا، کبھی کسی شعر کا مصرع سامنے آتا اور کبھی ڈاکٹر عصمت موجودہ زمانے کے کسی بنیادی سوال پر ٹھہر کر بات کرتے۔

بات ان کے ادبی سفر کے آغاز سے چلی اس دوران انہوں نے دور سے ہی بیٹھے بیٹھے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بتایا کہ مشرق سے میرا کافی پرانا واسطہ اور تعلق ہے کیونکہ میری پہلی غزل مشرق ہی میں شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ میرے لئے بھی ایک یادگار مرحلہ تھا۔ آٹھویں جماعت میں میری ایک غزل روزنامہ مشرق میں شائع ہوئی۔ اس عمر میں آدمی کو شاید یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اخبار میں چھپنے کا مطلب کیا ہے، لیکن جب اپنا نام اور اپنا کلام اخبار میں دیکھتا ہے تو ایک عجیب سا حوصلہ پیدا ہوتا۔

''یعنی شاعری کی طرف باقاعدہ سفر وہیں سے شروع ہو گیا تھا؟''

کہنے لگے، ''شاید سفر پہلے سے شروع ہو چکا تھا، مگر مشرق میں غزل کی اشاعت نے اس سفر کو ایک شناخت ضرور دی۔ پھر ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پروگراموں تک رسائی ہوئی۔ مشاعروں میں کلام پڑھنے کا موقع ملا۔ یوں ادب میرے لئے کسی ایک دن کا واقعہ نہیں رہا بلکہ رفتہ رفتہ زندگی کا حصہ بنتا گیا۔

وہ بتاتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں شعر پڑھنے اور سنانے کے ساتھ ساتھ انہیں چھوٹے موٹے معاوضے بھی ملتے تھے۔ ایک طرف تعلیم جاری تھی اور دوسری طرف لفظوں کی دنیا انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کی علمی صلاحیتیں بھی نمایاں ہو رہی تھیں۔ تعلیمی



آٹھویں جماعت میں پہلی غزل ''مشرق'' میں چھپی، تب سے اب تک ادب کے ساتھ تعلق قائم ہے

زبانیں گلوبلائزیشن سے لڑ کر نہیں، زمانے کے ساتھ چل کر زندہ رہیں گی

ادب کو گروہ بندی نہیں بلکہ تخلیقی دیانت درکار ہے، شاعری میرے لئے انتخاب نہیں، ایک داخلی ضرورت ہے

شور سے زیادہ تخلیقی کام ضروری ہے، معروف ادیب و شاعر پروفیسر ڈاکٹر عصمت درانی کی مشرق سے خصوصی بات چیت

میدان میں بھی انہوں نے اچھی کارکردگی دکھائی، لیکن شعر سے تعلق مسلسل قائم رہا۔

ڈاکٹر عصمت نے اپنی کتاب میں ان لوگوں سے جو ان سے شاعری کا جواز پوچھتے ہیں کچھ سوالات کئے ہیں کہ ہوا کیوں چلتی ہے؟ پانی کیوں بہتا ہے؟ کلی کیوں کھلتی ہے؟ مینہ کیوں برستا ہے؟ میں شاعری بھی اسی لئے کرتا ہوں۔

یہ جملہ ان کے شعری مزاج کو سمجھنے کے لئے شاید کسی طویل نظریاتی وضاحت سے زیادہ کافی ہے۔ ان کے نزدیک شاعری کوئی مصنوعی سرگرمی یا ادبی منصب حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں۔ یہ اندر سے اٹھنے والی ایک ضرورت ہے۔ اسی لئے ان کی گفتگو میں شاعری کے بارے میں کسی دعوے کی بجائے ایک طرح کی بے ساختگی محسوس ہوتی ہے۔

انہوں نے کہا، شاعری اگر صرف اس لئے کی جائے کہ لوگ شاعر کہیں تو شاید وہ زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔ میرے لئے یہ میرے وجود کا حصہ ہے۔ میں اس سے الگ ہو کر خود کو مکمل محسوس نہیں کرتا۔

ڈاکٹر عصمت درانی کی شاعری میں ذاتی کیفیت کے ساتھ اجتماعی تجربہ بھی جگہ بناتا ہے۔ محبت ہو، تنہائی ہو، معاشرتی بے سمتی ہو یا انسان کے اندر کی کشمکش، ان کے ہاں یہ سب الگ الگ خانوں میں نہیں رہتے۔

بات ان کے شعری اسلوب کی ہوئی تو انہوں نے کہا کہ انسان کو صرف اس کے ظاہر سے نہیں پڑھا جا سکتا۔

ڈاکٹر عصمت درانی کا ایک شعر ہے کہ

یہ دریا ہے، کوئی اندازہ کر سکتا نہیں اس کا
کنارے پر سکوں ہے، بیچ میں گرداب رکھا ہے

یہ شعر صرف دریا کا بیان نہیں بلکہ شاید خود انسان کی ایک



تصویر بھی

ہے۔ باہر سے پرسکون دکھائی دینے والی شخصیت کے اندر کتنے موسم، کتنی لہریں اور کتنے گرداب حرکت کر رہے ہوتے ہیں، اس کا اندازہ صرف ظاہری چہرے سے نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر عصمت کے نزدیک شاعر کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ ان پوشیدہ کیفیتوں کو زبان دے جو عام آدمی محسوس تو کرتا ہے لیکن انہیں بیان نہیں کر پاتا۔

گفتگو معاشرتی رویوں کی طرف مڑی تو انہوں نے انسانی تعلقات میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں پر بات کی۔ ان کے ہاں خلوص کوئی کمزور رویہ نہیں، لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خلوص کا صلہ ہمیشہ خلوص نہیں ہوتا۔

ادبی منظرنامے پر بات ہوئی تو ڈاکٹر عصمت نے ادبی گروہ بندیوں، نمائشی سرگرمیوں اور غیر ضروری شور سے زیادہ تخلیقی کام کی اہمیت پر زور دیا۔

ان کا کہنا تھا کہ ادب کسی گروہ، حلقے یا چند لوگوں کی ملکیت نہیں۔ اصل چیز تخلیق ہے۔ آدمی لکھ رہا ہے، اس کا کام پڑھا جا رہا ہے، لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں تو یہی اس کی اصل شناخت ہے۔

انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ادیب کو اپنے عہد سے لاتعلق نہیں ہونا چاہئے۔ معاشرہ تبدیل ہو رہا ہے، اس لئے ادب کے سوال بھی بدل رہے ہیں۔ نئے مسائل کو صرف پرانی اصطلاحات سے نہیں سمجھا جا سکتا۔

ہمیں اپنے زمانے کو سمجھنا ہوگا۔ صرف ماضی پر فخر کرنے سے مستقبل نہیں بنتا۔ روایت ضروری ہے، لیکن روایت کو زندگی کے ساتھ چلنا بھی آنا چاہئے۔

ہم اکثر انسان کو اس کے لباس، حیثیت، غربت یا ظاہری حالت سے جانچ لیتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ کسی شخص کے پاس وسائل کم ہو سکتے ہیں، مگر اس کے اندر صلاحیت، عزتِ نفس اور خواب بہت بڑے ہو سکتے ہیں۔

ان کے خیال میں معاشرے کی اصل آزمائش یہی ہے کہ وہ اپنے کمزور دکھائی دینے والے انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔

گفتگو کا ایک اہم حصہ زبان اور گلوبلائزیشن کے موضوع پر تھا۔ ڈاکٹر عصمت کے نزدیک زبانوں کا مستقبل محض جذباتی نعروں سے محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔

وہ کہتے ہیں کہ صرف ایک دن کلچر ڈے منانے سے زبان نہیں بچ سکتی۔ ایک دن پگڑی باندھ کر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری زبان محفوظ ہو گئی۔ زبان کو زندہ رکھنا ہے تو اسے تعلیم، تحقیق، سائنس، ٹیکنالوجی اور آئی ٹی سے جوڑنا ہوگا۔

انہوں نے سوال اٹھایا کہ اگر دنیا تیزی سے بدل رہی ہے تو ہم اپنی زبانوں کو اس تبدیلی سے الگ کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟

''گلوبلائزیشن ایک حقیقت ہے۔ ہمیں اس سے بھاگنا نہیں بلکہ خود کو اس کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ہے۔ اگر ہم اپنی زبان کو نئی دنیا کے علوم اور ذرائع سے جوڑیں گے تو وہ زندہ رہے گی۔ لیکن اگر ہم اسے صرف تقریروں اور ثقافتی دنوں تک محدود کر دیں گے تو پھر خطرہ پیدا ہوگا۔''

ان کے نزدیک زبان اور ثقافت کو محفوظ رکھنے کا راستہ دنیا سے کٹ جانا نہیں بلکہ دنیا میں اپنی شناخت کے ساتھ داخل ہونا ہے۔

آخر میں گفتگو زندگی کے عمومی فلسفے تک پہنچی۔ ڈاکٹر عصمت نے کہا کہ حالات خواہ کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں، انسان کو اپنی داخلی روشنی سے رشتہ نہیں توڑنا چاہئے۔

ڈاکٹر عصمت درانی سے یہ نشست ختم ہوئی تو محسوس ہوا کہ ان کے ہاں شاعر اور ڈاکٹر دو الگ الگ شخصیتیں نہیں۔ ایک جسم کے درد کو سمجھتا ہے، دوسرا روح کے درد کو لفظ دیتا ہے۔ ایک نبض دیکھتا ہے، دوسرا زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے۔ شاید اسی لئے ان کے لئے شاعری کوئی مشغلہ نہیں، بلکہ زندگی کو سمجھنے کا ایک دوسرا طریقہ ہے۔

☆.....☆

شش جہات

(نثری تحریروں کے چھ مستقل مجموعے)



عِصمت دُرّانی







فیصل آباد میڈیکل یونیورسٹی کو ایک تجربہ کار اور قابل سربراہ مل گیا



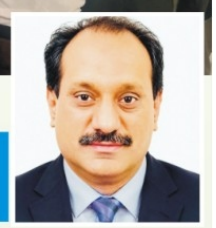




وزیراعلیٰ مریم نواز شریف کی ہدایات کے تحت صحت کے شعبے میں شفافیت، مفت سہولیات اور حفاظتی انتظامات کو ترجیح دی جارہی ہے

نئے تعینات ہونے والے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر سید اصغر نقی کا تفصیلی تعارف، کارہائے نمایاں، ویژن، توقعات اور عوامی شکریہ

مقصود خالد
بیورو چیف لاہور



وزیراعلیٰ پنجاب مریم نواز شریف کی قیادت میں صحت اور میڈیکل تعلیم کے شعبے میں جو مثبت، عوام دوست اور میرٹ پر مبنی تبدیلیاں سامنے آرہی ہیں، ان میں سب سے نمایاں، خوش آئند اور دور رس اثرات رکھنے والا اقدام فیصل آباد میڈیکل یونیورسٹی کے لیے ایک ایسے تجربہ کار، معتبر، انسانیت سے محبت رکھنے والے اور ملک بھر میں پہچانے جانے والے پروفیسر کی تعیناتی ہے جو نہ صرف اپنی پیشہ ورانہ قابلیت، سرجیکل مہارت اور انتظامی صلاحیت کے باعث ایک مثالی شخصیت سمجھے جاتے ہیں بلکہ اپنی اخلاقی اقدار، مریضوں کے ساتھ ہمدردی، طلباء کی تربیت اور کرپشن سے پاک طرزِ حکمرانی کی وجہ سے بھی عوامی اعتماد کا مرکز بن چکے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر سید اصغر نقی کی بطور وائس چانسلر فیصل آباد میڈیکل یونیورسٹی تعیناتی کو نہ صرف علمی، طبی اور انتظامی حلقوں میں بلکہ فیصل آباد کے عام شہریوں، سماجی کارکنوں، مریضوں کے طبقات، ڈاکٹرز، نرسز، پیرامیڈیکل اسٹاف اور طلباء و طالبات میں بھی ایک بہترین، شفاف اور میرٹ پر مبنی انتخاب قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ تعیناتی حکومت پنجاب کے خصوصی ہیلتھ کیئر اینڈ میڈیکل ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی تفصیلی سمری اور سرچ کمیٹی کی سفارشات پر وزیراعلیٰ پنجاب محترمہ مریم نواز شریف کی منظوری کے بعد عمل میں آئی ہے اور اسے پنجاب کے صحت کے شعبے میں اصلاحات، شفافیت اور عوامی فلاح کے تسلسل کا ایک اہم باب سمجھا جا رہا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سید اصغر نقی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا شمار پاکستان کے نامور، تجربہ کار اور قابلِ احترام سرجنز میں ہوتا ہے۔ انہوں نے 1985 میں ملک کے سب سے قدیم، معتبر اور علمی روایات کے حامل ادارے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور (اب کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی) سے گریجویشن (MBBS) حاصل کی۔ اس کے بعد میو ہسپتال لاہور اور برطانیہ کے میڈوے ہسپتال گلنگھم کینٹ میں پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ حاصل کی۔ جنرل اور لیپروسکوپک سرجری کے ماہر ہونے کے ناطے انہوں نے لاہور کے مختلف میڈیکل کالجز میں سینئر رجسٹرار، اسسٹنٹ پروفیسر اور ایسوسی ایٹ پروفیسر آف سرجری کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ سعودی عرب میں القصیم یونیورسٹی بریدہ میں شعبہ سرجری کی بنیاد رکھنا اور اس کے پہلے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کے طور پر کام کرنا ہے۔





انہوں نے سرجری میں اپنی ایک نئی تکنیک HOLESINGLEASSISTED CHOLECYSTECTOMY (ASHCHOLE) متعارف کرائی اور اس کے لیے ایک خصوصی آلہ بھی ایجاد کیا جو عالمی سطح پر سراہا گیا۔ جولائی 2007 سے دسمبر 2008 تک وہ پروفیسر آف سرجری، فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور رہے، 16 دسمبر 2008 سے یکم دسمبر 2012 تک پروفیسر آف سرجری، علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں خدمات دیں جہاں انہوں نے ریسرچ کلچر کو فروغ دیا۔ بعدازاں انہیں پرنسپل خواجہ محمد صفدر میڈیکل کالج سیالکوٹ تعینات کیا گیا جہاں انہوں نے نئے بننے والے اس میڈیکل کالج کی تعمیر اور قیام کی مشکل ذمہ داری احسن طریقے سے نبھائی۔ اس کے بعد وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی کے رجسٹرار کے اہم عہدے پر فائز رہے جہاں انہوں نے یونیورسٹی کے انتظامی امور میں بہترین اصلاحات کیں۔ ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں صدر پاکستان نے انہیں 23 مارچ 2018 کو تمغہ امتیاز سے نوازا۔ اس سے قبل بھی وہ 24 جولائی 2018 کو فیصل آباد میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں اور اب دوبارہ ان کی تعیناتی حکومت کے اعتماد کا مظہر ہے۔

فیصل آباد کے تمام طبقات نے اس تعیناتی پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور وزیراعلیٰ مریم نواز شریف کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے میرٹ پر ایک تجربہ کار اور قابل شخصیت کا انتخاب کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر سید اصغر نقی کی قیادت میں فیصل آباد میڈیکل یونیورسٹی اور الائیڈ ہسپتال ترقی کی نئی راہیں طے کریں گے اور عوامی فلاح کا حقیقی مرکز بنیں گے۔



وزیراعلیٰ مریم نواز شریف کی ہدایات پر محکمہ صحت کے اعلیٰ افسران کی جانب سے نئے وائس چانسلر کا استقبال کیا گیا۔ وزیراعلیٰ کی ہدایت پر نئے وائس چانسلر سے توقعات بہت زیادہ ہیں۔ الائیڈ ہسپتال میں مریضوں کی فلاح کے لیے ایمرجنسی میں بیڈز کی کمی دور کرنا، مفت ادویات کی باقاعدہ فراہمی یقینی بنانا اور سینئر ڈاکٹروں کی 24 گھنٹے موجودگی کو یقینی بنانا شامل ہے۔ ینگ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن (YDA) کے وفد نے بھی ان سے ملاقات کر کے یہ امید ظاہر کی ہے۔ میڈیکل تعلیم اور ریسرچ میں انقلاب لانا بھی ان کے ایجنڈے کا حصہ ہے تاکہ FMU صرف ڈگری دینے والا ادارہ نہ رہے بلکہ اسٹیٹ آف دی آرٹ ریسرچ یونیورسٹی بنے جہاں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلباء کو اخلاقیات اور جدید تحقیق کے ساتھ اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ زیرو پرائیویٹ پریکٹس پالیسی کے تحت انہوں نے 13 نکاتی حلف نامہ پر دستخط کیے ہیں تاکہ وہ کل وقتی طور پر ادارے کو وقت دیں۔

فیصل آباد کے شہریوں، ڈاکٹرز، طلباء اور سماجی طبقے نے حکومت پنجاب اور وزیراعلیٰ مریم نواز شریف کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے ایک ایماندار، قابل اور تجربہ کار شخصیت کو سربراہ بنایا۔ انشاءاللہ ان کی قیادت میں FMU ترقی کی نئی منازل طے کرے گا اور الائیڈ ہسپتال غریب مریضوں کے لیے بہترین ماحول فراہم کرنا چاہتے ہیں تاکہ تعلیم اور علاج دونوں معیاری ہوں۔

جائے۔ وہ طلباء و طالبات اور ہسپتال کے مریضوں دونوں

الائیڈ ہسپتال میں مریضوں کی فلاح کے لیے ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں بیڈز کی تعداد بڑھانا، مفت ادویات کی باقاعدہ سپلائی یقینی بنانا اور سینئر کنسلٹنٹس کی 24 گھنٹے دستیابی کو یقینی بنانا ان کے اہم اہداف ہیں۔ ڈاکٹر نقی کی قیادت میں ادارے کی انتظامیہ نے حفاظتی آلات کی فراہمی اور عملے کی تربیت پر توجہ مرکوز کی ہے۔ زچہ و بچہ وارڈز سمیت دیگر شعبوں میں بنیادی آلات اور ادویات کی دستیابی یقینی بنانے کی کوششیں جاری ہیں









پروفیسر ڈاکٹر سید اصغر نقی کی زندگی اور کیریئر کا مطالعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک ماہر سرجن ہیں بلکہ ایک بہترین استاد، منتظم اور انسان دوست شخصیت بھی ہیں۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے گریجویشن کے بعد ان کی پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ نے انہیں جدید سرجیکل تکنیکوں سے آراستہ کیا۔ میو ہسپتال لاہور اور برطانیہ کے میڈ وے ہسپتال میں حاصل کردہ تجربے نے ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو مزید نکھارا۔ لیپر وسکوپک سرجری میں ان کی مہارت اور خاص طور پر ASCHOLE تکنیک کی ایجاد نے انہیں بین الاقوامی سطح پر پہچان دلائی۔ القصیم یونیورسٹی میں شعبہ سرجری کی بنیاد رکھنے کا کارنامہ ان کی قیادی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج اور علامہ اقبال میڈیکل کالج میں پروفیسر کے طور پر خدمات کے دوران انہوں نے نہ صرف تدریسی معیار بلند کیا بلکہ ریسرچ کلچر کو بھی فروغ دیا۔ خواجہ محمد صفدر میڈیکل کالج سیالکوٹ میں پرنسپل کے طور پر نئے ادارے کی تعمیر و ترقی کی ذمہ داری انہوں نے کامیابی سے نبھائی۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدے پر انتظامی اصلاحات ان کی انتظامی بصیرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ تمغہ امتیاز کی اعزازیابی ان کی خدمات کا سرکاری اعتراف ہے۔ 2018 میں پہلے دورِ وائس چانسلری کے تجربے نے انہیں FMU کے مسائل اور امکانات سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے، اس لیے ان کی دوبارہ تعیناتی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

وزیراعلیٰ مریم نواز شریف کے صحت کے ویژن کے تحت پنجاب میں ہسپتالوں کی اپ گریڈیشن، مفت ادویات کی فراہمی اور مفت تشخیصی ٹیسٹوں کا سلسلہ جاری ہے۔ فیصل آباد میں الائیڈ ہسپتال کو جدید خطوط پر استوار کیا جا رہا ہے تاکہ مریضوں کو بہترین سہولیات مل سکیں۔ پروفیسر ڈاکٹر اصغر نقی اس وژن کو عملی جامہ پہنانے میں کلیدی کردار ادا کریں گے۔ ان کے دور میں روزانہ کے کام کی بروقت تکمیل، کرپشن کے خاتمے اور نااہلی و غفلت کی عدم برداشت کو یقینی بنایا جائے گا۔ طلباء و طالبات کے لیے معیاری تعلیم اور مریضوں کے لیے بہترین علاج ان کی ترجیحات ہوں گی۔

الائیڈ ہسپتال میں مریضوں کی فلاح کے لیے ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں بیڈز کی تعداد بڑھانا، مفت ادویات کی باقاعدہ سپلائی یقینی بنانا اور سینئر کنسلٹنٹس کی 24 گھنٹے دستیابی کو یقینی بنانا ان کے اہم اہداف ہیں۔ میڈیکل تعلیم میں ریسرچ کو فروغ دینا، اخلاقیات کی تعلیم کو ترجیح دینا اور FMU کو جدید تحقیقی یونیورسٹی بنانا ان کے وژن کا حصہ ہے۔ زیرو پرائیویٹ پریکٹس پالیسی پر عمل درآمد سے وہ ادارے کو مکمل وقت دیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر سید اصغر نقی فیصل آباد میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے طور پر پنجاب حکومت کے ویژن کے مطابق طبی اداروں میں بہتری کے لیے کوشاں ہیں۔ انہوں نے الائیڈ ہسپتال سمیت وابستہ اداروں میں مریضوں کی حفاظت، سہولیات اور انتظامی معیار بلند کرنے پر زور دیا ہے۔ وزیراعلیٰ مریم نواز شریف کی ہدایات کے تحت صحت کے شعبے میں شفافیت، مفت سہولیات اور حفاظتی انتظامات کو ترجیح دی جا رہی ہے، اور ڈاکٹر نقی اس عمل کو عملی جامہ پہنانے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ الائیڈ ہسپتال جیسے بڑے سرکاری اداروں میں آگ سے حفاظت ایک اہم مسئلہ رہا ہے، وارڈز سمیت دیگر شعبوں میں بنیادی آلات اور ادویات کی دستیابی یقینی بنانے کی کوششیں جاری ہیں تاکہ مریضوں کو بلا رکاوٹ علاج مل سکے۔



پروفیسر ڈاکٹر سید اصغر نقی کی بطور وائس چانسلر فیصل آباد میڈیکل یونیورسٹی تعیناتی کو نہ صرف علمی، طبی اور انتظامی حلقوں میں بلکہ فیصل آباد کے عام شہریوں، سماجی کارکنوں، مریضوں کے طبقات، ڈاکٹرز، نرسز، پیرامیڈیکل اسٹاف اور طلباء و طالبات میں بھی ایک بہترین، شفاف اور میرٹ پر مبنی انتخاب قرار دیا جا رہا ہے





پنجاب حکومت کے تحت صحت کے شعبے میں متعدد اصلاحات نافذ کی جا رہی ہیں، جن میں جدید مشینری کی فراہمی، ایمرجنسی سروسز کی بہتری اور مفت علاج کے پروگرام شامل ہیں۔ ڈاکٹر نقی ان اقدامات کو مقامی سطح پر نافذ کرنے میں معاون ہیں۔ بچوں کے وارڈز اور زچہ و بچہ شعبوں میں خصوصی توجہ دی جا رہی ہے تاکہ ماؤں اور نوزائیدہ بچوں کو بہتر دیکھ بھال مل سکے۔ ان کی قیادت میں ادارہ حکومتی ہدایات کے مطابق آگے بڑھ رہا ہے، اور وہ بہترین ایڈمنسٹریٹر کے طور پر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ فیصل آباد کے تمام طبقات نے اس تعیناتی پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور حالیہ عرصے میں صوبائی سطح پر فائر سیفٹی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر نقی کی قیادت میں ادارے کی انتظامیہ نے حفاظتی آلات کی فراہمی اور عملے کی تربیت پر توجہ مرکوز کی ہے۔ زچہ و بچہ وارڈز سمیت دیگر شعبوں میں بنیادی آلات اور ادویات کی دستیابی یقینی بنانے کی کوششیں جاری ہیں تاکہ مریضوں کو بلا رکاوٹ علاج مل سکے۔

مفت ادویات اور طبی سہولیات کی فراہمی پنجاب حکومت کی ترجیحات میں شامل ہے، اور ڈاکٹر نقی نے واضح کیا ہے کہ کسی بھی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی۔

ڈاکٹر نقی ایک تجربہ کار سرجن اور استاد ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی معاملات میں بھی فعال ہیں۔ ان کی سابقہ ذمہ داریاں علامہ اقبال میڈیکل کالج میں پرنسپل کے طور پر رہ چکی ہیں، جہاں انہوں نے ادارتی ترقی اور طلبہ کی تربیت پر کام کیا۔ فیصل آباد میں وہ یونیورسٹی اور وابستہ ہسپتالوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حکومت کے احکامات پر عمل پیرا رہتے ہوئے وہ وارڈز میں سہولیات کی نگرانی، عملے کی کارکردگی اور مریضوں کی شکایات کے فوری حل پر زور دیتے ہیں۔

ہے اور وزیراعلیٰ مریم نواز شریف کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے میرٹ پر ایک تجربہ کار اور قابل شخصیت کا انتخاب کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر سید اصغر نقی کی قیادت میں فیصل آباد میڈیکل یونیورسٹی اور الائیڈ ہسپتال ترقی کی نئی راہیں طے کریں گے اور عوامی فلاح کا حقیقی مرکز بنیں گے۔

☆.....☆